موسم اندر باہر کے
وسیم بریلوی

موسم اندر باہر کے

نظموں اور گیتوں کا مجموعہ

وسیم بریلوی

شعری مجموعہ : موسم اندر باہر کے

شاعر : وسیم بریلوی

زیرِ اہتمام : سید راشد حامدی، 9811126467

مطبوعہ : لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)

پہلی بار جون 2007 تعداد 1000 قیمت 150 روپے

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار جامع مسجد، دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ۔ ممبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ

انتساب:

عظیم دوست نعیم خاں مرحوم کی یادوں
مخلص محسن ڈی۔ این۔ آریا کی محبتوں
سراپا ایثار روی اندر گل کی رفاقتوں

کے نام

تن من اور روح کو تسکین دینے والے جادوگر ہیں جناب وسیم بریلوی کے یہ گیت

ڈاکٹر کنور بےچین

نظم بحرِ دل کی متلاطم لہروں پر تیرنے والے جہاز کی مانند ہے اور گیت سمندر میں زیرِ آب چلنے والی آبدوز کشتیوں کی چلت پھرت ہے۔ مراد یہ ہے کہ گیت قدرے باطنی صنف ہے۔ گیت لکھتے وقت تخلیق کار کو اپنا رخ داخلی محسوسات کی سمت کر کے چلنا پڑتا ہے۔ جیسے آبدوز کشتی میں شفاف شیشوں کے ذریعہ سمندر میں پھیلی ہوئی دنیا کا نظارا کیا جا سکتا ہے ٹھیک اسی طرح گیت بھی دل کی دنیا میں جو کچھ بھی ہے اسے دیکھنے اور شاعرانہ انداز میں اس کے اظہار کا بےمثل آرٹ ہے۔ شاعرانہ انداز کہنے سے مراد یہ ہے کہ اس میں جذبات، شعور اور تخیل کا اتصال کچھ اس طرح سے ہوتا ہے کہ اس میں نغمگی، ترنم اور موسیقیت کو ایک ساتھ پیش کرنے کا فطری عمل خود بخود وجود پذیر ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے گیت میں یکسوئی یعنی ایک ہی نقطے کو دیکھنے یا اس پر اشعار کی تخلیق کا کام ہوتا رہتا ہے۔ یکسوئی سے ایک لمحہ کے لیے بھی انحراف کا مطلب ہے گیت کو کمزور کرنا یا اس سے دور ہو جانا۔ گیت میں ایک مرکزی احساس پایا جاتا ہے جو پورے گیت میں تخلیق کار اپنے منفرد

لب ولہجہ میں اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ قاری یا سامع کے دل میں تقریباً اسی احساس کو جگا سکے جو تخلیق کار کے دل میں ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ گیت تخلیق کار کے دل سے سامع یا قاری کے دل تک کا سفر ہے اور یہ دل سے دل کا سفر بھی، کچھ اس طرح کہ جو گیت کو ایک ہونٹوں سے دوسرے ہونٹوں تک لے جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عظیم دانشور آچاریہ ہزاری پرساد دویدی نے آج کے گیتوں کو دُور سے آتی ہوئی عظیم الشان زبانی روایت کا آئینہ دار تسلیم کیا ہے۔ جہاں تک زبانی تہذیب کا تعلق ہے تو وہ ہندوستان کی عوامی زندگی میں رچے بسے لوک گیتوں میں ہی سب سے زیادہ شامل اور محفوظ رہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لوک گیتوں میں عوامی زندگی، عوامی تہذیب، عوامی زبان اور عوامی سُروں کا ایسا روحانی سنگم ہے کہ وہ سامعین کو بے ساختہ عالم جذبات میں لے آتا ہے۔ اگر اس میں انبساط وخوشی ہے تو سامع مسرور ہو اٹھتا ہے، اگر اس میں رنج والم ہے تو سامع آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لوک گیتوں کا قلب سے سیدھا تعلق ہے۔ ہم اپنی زندگی کو تین سطحوں پر گزارتے ہیں — جسمانی سطح، دلی سطح اور روحانی سطح، شاعری ان تینوں میں دلی سطح کے تلاطم کا جشن ہے۔۔۔۔ اور لوک گیت تو محض جشن ہی نہیں، جشنِ عظیم ہے۔ دلی سطح سے ہی ہم روحانی سطح کی جانب مُڑ سکتے ہیں۔ اس لیے لوک گیت دل سے زیادہ قریب ہیں۔

یہ ساری باتیں میں اس لیے کہہ رہا ہوں کیوں کہ میں اس وقت اردو میں اپنا امتیازی مقام ومرتبہ رکھنے والے عالمی شہرت یافتہ شاعر جناب وسیم بریلوی کے گیتوں کو پڑھ رہا ہوں۔ ان کے گیتوں میں مجھے ہندوستانی سماج میں پھیلے ہوئے انہی عناصر کی بہتات ملتی ہے۔ وہ عوامی عناصر جو جناب وسیم کے گیتوں کو ہندی گیت کے تسلسل کی اس کڑی سے جوڑنے میں فعال ہو رہے ہیں وہ لوک گیتوں کے نام سے معروف ہیں اور جنھیں ہمیشہ

شعروادب میں ایک باوقار درجہ حاصل رہا ہے۔ ان کے گیتوں میں جذبات کا جو اظہار ہے اس کا زیادہ تر حصہ ایسا ہے جو پیار کرنے والی ایک بھولی بھالی گاؤں کی لڑکی کے تن کی تصویر کشی کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی زبان اور اظہار خیال تکلفات سے دور، سہل اور آسان ہے۔ سہولت و آسانی زمانۂ قدیم سے ہی شاعری میں جذبابیت اور انبساط کا سرچشمہ رہی ہے۔ وسیم صاحب کے یہ گیت اسی وجہ سے دل کو چھونے والے ہیں۔ وہ پیارے ہیں کیوں کہ وہ آسان ہیں ان میں موہ لینے کی قوت ہے کیوں کہ وہ سہل ہیں۔ اب بات ذرا دوسری جانب موڑتے ہیں اور وہ بات یہ ہے کہ ان دنوں ایک زبان کا ادب دوسری زبان کے ادب اور اس کی اہم اصناف سے نہ صرف باہم دگر متعارف ہورہا ہے بلکہ اسے جذب بھی کررہا ہے۔ ہندی میں ان دنوں صنف غزل اس کی شاہد ہے۔ اردو غزل گو جتنی غزلیں کہہ رہے ہیں کم وبیش ہندی میں بھی اتنی ہی غزلیں کہی جارہی ہیں۔ اسی طرح اردو کے شاعروں نے ہندی کی اہم اصناف — گیت اور دوہے — کو بھی اپنالیا ہے۔ دوہے کا چلن تو ان دنوں پاکستان میں بھی خوب رائج ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ تبادلۂ زبان، بیان اور تبادلۂ خیالات آج ہی کے دور میں ہورہا ہے، بلکہ ہندی ادب کے دور آغاز اور دور متوسط میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ تیرہویں صدی میں امیر خسرو، جو ہندوستان کے پہلے غزل گو شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں انھوں نے غزل کے ساتھ ساتھ دوہے، رباعیات اور مکریوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

عبدالرحیم خانخاناں نے دوہے کی صنف کو ترقی دی، اسے کون نہیں جانتا۔ اس خان کے سوہے (ہندی نظم کی ایک صنف) ہندوستانی سماج کے ہر فرد کے لبوں پر ہیں۔ نذیر نے بھی لوک جیون سے جڑی نظمیں لکھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور یکجہتی کا کام جتنا کویوں اور شاعروں نے کیا اتنا ہمارے سیاستداں بھی نہیں

کر سکے۔ اسی قابل فخر روایات میں اردو کے اہم شاعر جناب وسیم بریلوی نے بھی گیت لکھ کر اپنا نام شامل کر لیا ہے اور یہ اتصال کوئی معمولی نہیں ہے بلکہ خصوصی مقام حاصل کر چکا ہے خصوصی اس لئے کہ ان کے گیت عوامی زندگی سے جڑے ہیں۔

آیئے، ہم جناب وسیم کے گیتوں کا رخ کرتے ہیں۔ میرے سامنے ان کے اٹھارہ گیت ہیں گیت کے اٹھارہ ابواب کی مانند۔ جیسا کہ پہلے بھی میں نے اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ جناب وسیم نے ان گیتوں میں ایک ایسی 'الھڑ' بھولی بھولی صورت کا کردار پیش کیا ہے جو طرح طرح سے خود کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ پیار کرنا جانتی ہے۔ پیار کے احساسات اسے طرح طرح کے جذباتی اور جسمانی عمل سے گزارتے ہیں۔ وہ محبوب سے ملنا چاہتی ہے، مگر مل نہیں پاتی۔ کچھ تو اس کی اپنی شرم وحیا اس کا راستہ روکتی ہے اور کچھ سماجی بندھن ہیں جو اسے آزادی سے ہمکنار نہیں ہونے دیتے۔ بے شمار لکشمن ریکھائیں ہیں جو اسے دہلیز پار کرنے سے روکتی ہیں۔ یہ وہ کردار ہے جسے اس کے اپنے محبوب کی ایک نظر ''دھوپ سے چھاؤں'' کر دیتی ہے۔ کیوں کہ اس کے ''تن کی تپتی ریت پر'' محبوب کی پیار بھری نگاہ ''شبنم کی بوندوں'' کا احساس دلاتی ہے۔ محبت میں اگر کوئی مبتلا ہو جائے تو پھر اسے ساری دنیا نئی نویلی نظر آتی ہے۔ اس لیے اس کردار کو بھی روز کے دیکھے بھالے منظر کچھ اور ہی نظر آتے ہیں۔ اسے ایسا لگتا ہے، جیسے دنیا بھر کی ندیاں اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں، اور جیسے ہی کنارہ ہاتھ میں آتا ہے ویسے ہی وہ ڈوب سی جاتی ہے۔ پیار کی ندی سچ مچ ہے ہی ایسی۔ ہدف ملنے کو ہوتا ہے کہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ یہ بات الگ رہی کہ اس کا 'میں' اب 'میں' نہیں رہا ہے۔ وہ 'تو' میں بدل گیا ہے اور یہ تبھی ہوتا ہے جب ایک کا دوسرے سے اتصال ہو۔ جب کوئی فرق نہیں ہے عدم اور وجود کی تفریق مٹ جائے تب ہی تو وہ کہتی ہے ——

کل تک جس درپن میں تھی اور میرے ویرانے
آج اسی درپن میں تو ہی تو ہے تو کیا جانے
میرے اندر چور چھپا ہے جانے کب پُر جاؤں
سجن ، یہ بات کسے بتلاؤں

لیکن اس حالت تک پہنچنا کوئی یونہی نہیں ہو گیا ہے! کتنی جدو جہد کرنی پڑتی ہے۔ محبوب تو بہت اونچائی پر ہے اسے چھونا، اسے پانا کیا آسان ہے۔ وہ تو امبر کی آنکھ کا تارا ہے۔ محبوبہ کے ہاتھ تو بہت چھوٹے ہیں۔ محبوب تو 'بھری برسات' ہے اور محبوبہ 'پانی کی ایک بوند' ہے۔ اگر اس بوند نے اپنے محبوب کی طرف بڑھنا چاہا تو پاؤں میں 'لکشمن ریکھا' لپٹ گئی۔ بے شمار رکاوٹیں آ گئیں۔ پھر بھی اس کی ایک چاہت تو جنم جنم رہے گی۔۔۔

جنم جنم مانگوں گی تجھ کو، تُو مجھ کو ٹھکرانا
میں ماٹی میں مل جاؤں گی تو ماٹی ہو جانا
لہر کے آگے کیا اک چھوٹے تنکے کی اوقات
سجن میں بھول گئی یہ بات

وہ کتنے خوش نصیب ہیں جو اپنے محبوب کو جلد ہی پا لیتے ہیں، ورنہ ملن کی راہ تو سوز میں بدل جاتی ہے۔ 'جب بادل کے روم روم من پینگ بڑھاتا ہے' اور 'تن میں بجری سی لہراتی' ہے تب نہ جانے کیا ہو جاتا ہے کہ یہ کردار 'چننا تو پھول چاہتی ہے لیکن کانٹا چبھ جاتا ہے'۔ وہ سب سے اپنے دل کا راز چھپانا چاہتی ہے لیکن 'ہوا کا ایک ہی جھونکا' سارے راز فاش کر دیتا ہے۔ اس کا اس کے پاس کچھ نہیں رہتا۔ یہی جھونکا اس کا سب کچھ لے جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں کئی بار تو کھیتوں کی ہریالی اسے طعنے مارتی اور ہنسی اڑاتی ہے، ساری

کائنات ہی اس سے ساجن کی دوری کا فائدہ اٹھاتی ہے۔ جو بھی ہیں محبوب سے ملنے کی راہ میں رخنہ ڈالنے والے ہی ہیں۔ پھر بھی پیا ملن کی آس اسے ہے۔

مست ہوا چنری سے کھیلے بے شرمی سکھلائے

پرکرتی بھی ساجن کی دوری کا لابھ اٹھائے

اتنے ہمت توڑنے والے اور مری اک آس

نہ جانے مجھ پر ہن کی پیاس

سچ مچ اس کردار کی پیاس کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ پیاس پیا ملن کی ہے۔۔۔۔۔۔ اور یہ پریتم کوئی معمولی محبوب نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ نہ اس کا پیار ہی معمولی پیار ہے۔ کردار کا من 'جھیلوں جیسا ہے' اور اس میں محبوب کا پیار 'لہروں جیسا ہے' جو ہر دم لہراتا رہتا ہے۔

کردار کی یہ تمنا ہے کہ اگر پھر کبھی اسے اپنی وہ جوانی مل جائے جو 'سپنا' ہوگئی ہے اور وہ پیار مل جائے جو 'اُڑتی تتلی' کی مانند ہے تو وہ خود کو متعدد شکلوں میں ڈھال لے گی۔ وہ 'پھول میں بس کر رہ جائے گی' اور 'خوشبو کے پر کتر دے گی' جس سے زندگی میں ہمیشہ بہار قائم رہے۔ اس لئے وہ اپنی عمر کے دروازے کو 'پت جھڑ کی جانب نہیں کھلنے دے گی'۔ وہ 'ساون کو چُنری بنا کر اوڑھ لے گی' اور اپنی سانسوں میں اس کی شیتل بوندوں کو رکھ لے گی'۔ یہی نہیں بلکہ 'چاند کی پیاسی کرنوں کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے کر' خود کو مالا مال کر دے گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اپنی عمر سے وہ ڈھلنے کا حق چھین لے گی، جس سے وہ ہمیشہ نوجوان بنی رہے۔ وہ اپنے 'سنیاسی ادھروں پر پیار کے چمبنوں کو بھی سوئیکرتی' دے گی۔۔۔۔ اور اب کی بار ساری 'مان مریاداؤں تتھا سوچ بچار کو چھوڑ دے گی' کیونکہ اسی مان مریادا کے سبب اس نے۔۔۔

کیسے کیسے بھاؤک پل ابھیمان کی بھینٹ چڑھائے
ساجن میں خود سوئی اور تجھے تارے گنوائے
اب نہ کبھی جیتوں گی میں نے مانی ایسی ہار
کہیں مل جائے پھر اک بار!

پیار میں ملن کی اہمیت تو ہوتی ہے مگر جدائی کا غم بھی کم اہمیت نہیں رکھتا۔ غم جدائی میں یہ کردار بے شمار ذہنی کیفیات سے گزرتی ہے جو اس کے جسم کو بھی متاثر کرتی ہے اس کے من میں طرح طرح کی تمنائیں اور آرزوئیں جنم لیتی ہیں۔ جس کی مثال مندرجہ بالا سطور میں پیش کی گئی ہے۔ سہیلیوں کی تو راتیں بھی جاگی ہوئی ہیں۔ یعنی خوشحالی میں اپنے محبوب کے ساتھ گزر رہی ہیں۔ لیکن یہ بدنصیب ایسی ہے کہ اس کے تو 'دن بھی سو رہے ہیں' یعنی ساری ہی عمر محبوب کی جدائی کے غم میں گزر رہی ہے چاہے وہ رات ہو یا دن، سبھی محبوب سے دور رہ کر گزر رہے ہیں۔ اس کی 'نیندوں کے ادھروں پر بھی پریے کی باتیں کھیل رہی ہیں' اور وہ 'پرتیک آہٹ پر چونک پڑتی ہے' جو اس کی 'اُنماد' اور 'ویادھی' کے حالات کی تصویر کشی کر رہی ہے۔ یہی نہیں یہ 'ویادھی' یہ مرض اس حالت تک لے آیا ہے جب 'مرن' کی حالت اپنا غضب لے کر آتی ہے تبھی تو وہ کہہ اٹھتی ہے—

کھیل ودھاتا ایک ابھاگن سے یہ کیسا کھیلا
ارتھی کے رتھ پر ہی بیٹھ کے آئی ملن کی بیلا
آنکھ اٹھا کر دیکھ نہ پائی تھی کہ ساجن کھوئے
جوانی پیاس سے دامن دھوئے

-----آخر محبوب سے ملن بھی ہوا تو اس وقت جب 'ارتھی کا رتھ' نکل رہا تھا

اور وہ محبوب کو اس ارتھی کے رتھ میں بیٹھی ہوئی ایک پل کو بھی نہیں دیکھ پائی تھی کہ ساجن نظر سے اوجھل ہو گیا۔

جناب وسیم کے ان گیتوں میں کرداروں کا جو روپ ہے وہ محض دنیاوی کردار نہیں ہے بلکہ وہ ہندوستانی فلسفے کے مطابق روح ہے جو اپنے محبوب سے، اپنے خدا سے ملنا چاہتی ہے اور اس سے ملنے کو نکل پڑی ہے۔ لیکن یہ دنیا اسے اپنے محبوب سے ملنے کہاں دے رہی ہے؟ جب بھی وہ اپنے محبوب سے، اپنے خدا سے ملنے نکلتی ہے تو اسے ایسی بے شمار احتیاطیں برتنی پڑتی ہیں جس سے یہ دنیا اسے نہ دیکھ لے، یہ دنیا روک نہ لے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ رات میں اپنے محبوب سے ملنے نکلتی ہے جب 'سناٹے کی چادر اوڑھ کر سارا گاؤں سو رہا ہوتا ہے' وہ 'پاؤں کی پایل کھول کر رکھ دیتی ہے' جس سے کوئی اس کے گھنگروؤں کی آواز سن کر جاگ نہ جائے اور کہیں اس کا راستہ نہ روک لے، وہ 'گاؤں کی چوپال' سے ہو کر جب گزرتی ہے تو 'سانسوں کو روکتی ہوئی سی' گزرتی ہے۔ کیوں کہ اسے لگتا ہے کہ یہ دنیا سانسوں کی آہٹ تک کو سن لیتی ہے۔

وسیم بریلوی سچ مچ ایسے شاعر ہیں جنھیں ہندوستانی فلسفہ اور ثقافت کے مختلف رویوں کی پوری جانکاری ہے تبھی تو وہ امیر خسرو کی طرح ہندوستانی فلسفے کو اپنے گیتوں میں اتار سکے۔ بالعموم جب اردو شاعری میں، عشق مجازی، اور عشق حقیقی، کی بات ہوتی ہے تو خدا کو معشوقہ اور روح کو عاشق مانا جاتا ہے۔ اردو ادب میں کہی گئی غزلیں اور سارا صوفی کلام اس کا شاہد ہے۔ لیکن وسیم صاحب نے کبیر کی طرح خدا کو عاشق (ساجن) اور روح کو معشوقہ مانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے وسیم صاحب کی شاعرانہ شخصیت کو ہندوستان کے روایتی گیت کاروں کی شخصیات سے جوڑا ہے۔

ناقدین ادب کا کہنا ہے کہ شاعر یا کوئی مرد ہوتے ہوئے بھی صنف نازک کا نصف خدا ہوتا ہے۔ وہ نسوانی فطرت اور اس کی ذہنی کیفیات سے اتنا متعارف ہوتا ہے کہ وہ مرد ہوتے ہوئے بھی عورت کی جانب سے ایسے خیالات کا اظہار کرتا ہے کہ دیکھنے والا اسے حیرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس میں ایسا نسوانی دل کہاں سے آ گیا۔ ہمارے ہاں شیو کو 'اردھ ناریشور' کا نام دیا گیا ہے جو اردھ ناریشور ہے وہ 'شیو' ہے اور شیو لفظ تو 'فلاح' اور 'احسان' کا مترادف ہے۔۔۔۔۔۔اور سب سے بڑی بھلائی تو خدا سے ملن میں ہے۔ وسیم بریلوی کے گیتوں میں بیشتر گیت ایسے ہیں جن میں یہ 'شیویت' ہے، جن میں عورت کردار کی طرف سے یعنی روح کی جانب سے دیا گیا وہ بیان ہے جو مرد یعنی خدا کے لیے کہا گیا ہے۔ ان کے گیت ایک طرف 'عشق مجازی' یعنی دنیاوی محبت کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو دوسری طرف انھیں اس بلند چوٹی کی طرف بھی لے جاتے ہیں جہاں 'عشق حقیقی' یعنی خدا کی محبت میں تڑپتی روح کی تڑپ دکھائی دیتی ہے۔ وسیم بریلوی کے گیت صرف محبت کے نقطے پر ہی مرکوز نہیں ہیں بلکہ انھوں نے دورِ حاضر میں نظر آنے والی بے شمار برائیوں کو بھی اپنے گیتوں کا موضوع بنایا ہے۔ وہ آج کے حکمرانوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں۔۔۔

چھوٹی چھوٹی خوشیاں اپنی۔ چھوٹے چھوٹے غم
ہم کیا جانیں ستادھری تیرے دین دھرم

وہ جانتے ہیں کہ حکومت پرست اپنی حکومت، اپنی کرسی کو بچانے میں لگے رہتے ہیں۔ ان کا دین دھرم تو صرف اپنی حکومت کو بچائے رکھنا ہے۔ ان کا دھیان عوام کی طرف کیا جاتا ہے جبکہ عام آدمی تو 'پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ادھر ادھر مارا مارا پھرتا ہے'،

دیس بدیس میں رہ کر اپنے گھر کا سپنا دیکھتا ہے، اس کے 'نین تو بنجارے بن کر' ادھر ادھر پھرتے ہیں۔ اس کے 'موسم تو کھیتوں کے سینے سے اُپجتے' ہیں شاعر کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہاں کا عام آدمی غریبی کے دور سے گزر رہا ہے—

کھیت پڑا ہے گروی جیسے غیر کے گھر گھر والی
اپنے باغ کی سیوا سے ونچت ہے باغ کا مالی
قرضہ کیسے اترے بانٹے کون کسی کا غم

یہی وجہ ہے کہ وسیم صاحب آج کی بیرونی ترقی کو ترقی نہیں مانتے، کیونکہ اس ترقی کے دور میں صرف امیر ہی مزید امیر ہوتے جا رہے ہیں اور غریب مزید غریب۔ یہی نہیں بلکہ اس عمل میں 'لوگوں کی پہچان کھوگئی ہے'—

کچھ ہوتا ہے کچھ دِکھتا ہے کچھ لاتا ہے ہاتھ
بھلا میں مانوں کس کی بات

یہی نہیں بلکہ اتنی ترقی ہونے کے بعد بھی ہم سب فرقہ پرستی کی آگ میں جھلس رہے ہیں، جل رہے ہیں اور راکھ ہو رہے ہیں۔ مندر اور مسجد کے نام پر نفرتیں اب بھی بول رہی ہیں—

مندر چپ ہے مسجد چپ ہے، نفرت بول رہی ہے
اور سیاست زہر کا کہاں تک پہنچا تول رہی ہے
کچھ کے لیے یہ آگ کا موسم، کچھ کے لیے برسات
بھلا میں مانوں کس کی بات

ادھر بہبود نسواں کی بہت دہائی دی جاتی ہے، بہت باتیں کی جاتی ہیں، لیکن ابھی

عورت کو وہ شرف کہاں ملا ہے جس کی وہ حقدار ہے۔

عورت کے سمّان سے بڑھ کر عورت کی مجبوری
مرد کو پورا کرنے ہی میں عورت ہوئی ادھوری
جنم جنم اس کی ہوجائے جس کو تھما دو ہاتھ
بھلا میں مانوں کس کی بات

لیکن وسیم صاحب ہندوستانی تہذیب کے اس روپ سے بھی واقف ہیں جو دیہی علاقوں میں اب بھی موجود ہے اور جو انسانیت کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور دکھ درد کی پہچان کرتی ہے۔ اس کے چند مناظر ملاحظہ کریں۔

چوپالوں میں گھر باہر کے جھگڑے طے ہوجائیں
کبھی کسی کے پکچھ میں جائیں کسی کو راس نہ آئیں
جس نے تھاما ہاتھ اسی کے دکھ میں آگے ہم

دکھ درد کا یہ پہلو بھی دیکھیں۔

غمی کسی کے گھر ہو سگرے گاؤں جلے نہ چولہا
بن آشیروچن بوڑھوں کے بنے نہ کوئی دولہا
کنیا اک گھر سے ہی جائے گھر گھر آنکھیں نم
چھوٹی چھوٹی خوشیاں اپنی چھوٹے چھوٹے غم

انہی وجوہات سے بریلی کے اس بڑے اور اہم شاعر کو اپنے 'گاؤں کی مٹی کی مہک' بڑی 'البیلی' لگتی ہے اور اس کا 'بھولا پن' ساری دنیا میں ایک 'پہیلی' کی طرح ہے، اس کا احساس کراتی ہے۔ اسی زمین پر وسیم صاحب نے ایک بہت ہی میٹھا، بہت ہی پیارا اور

بہت ہی اہم گیت لکھا ہے۔

میرے گاؤں کی مٹی تیری مہک بڑی البیلی
تیرا بھولاپن دنیا کی سب سے بڑی البیلی
تیرے آنگن میں اترے ہیں سچے سچے موسم
تو اپنے سیدھے سادے رنگوں میں بھاری بھرکم
تیرے سامنے کیا لگتے ہیں بیلا، جو ہی، چمیلی
تیری مہک بڑی البیلی
شور تھمے فصلیں انگڑائی لیں، جاگیں کھلیان
کھیتوں میں سورج اترے تو کرنیں لگیں کسان
تو صدیوں سے ایک ہی جیسی پھر بھی نئی نویلی
تیری مہک بڑی البیلی

اس طرح وسیم بریلوی گیتوں میں موضوع کے اعتبار سے جہاں ملن کے مناظر ہیں، برہ (غم جدائی) کے احساسات اور کیفیات ہیں، روحانیت ہے، فلسفہ ہے، زندگی کے عناصر ہیں، زندگی کے تضادات ہیں، دیش کی مٹی سے پیار ہے وہیں ان گیتوں کی فنکاری بھی اپنے نئے نئے پہلوؤں کو پیش کرتی ہے۔ وسیم صاحب کے ان گیتوں میں جو زبان ہے وہ جذبات کی پیروکار ہے، وہ سہج، سہل اور مٹھاس سے مالا مال ہے جو فوری اثر انداز ہوتی ہے اور اپنے مکمل معنٰی کے ساتھ۔ اس میں لوک بھاشا کے بے شمار مقامی و دیہی الفاظ کا بہت ہی کامیاب استعمال ہوا ہے۔ ان الفاظ کا اندازِ اظہار ہی بالکل مختلف ہے اور وہ بھی ایسا کہ ایک دم سمجھ میں آجاتا ہے جیسے ایک گیت میں بَیری لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ یہ بَیری لفظ اپنے

آپ میں کیسے گہرے احساسات لیے ہوئے ہے۔

میں کس بَیری کے گھر گئی
من جیت ہوئی، تن ہار گئی
میں کس بَیری کے گھر گئی

کیا کوئی اور لفظ ہے جو اس 'بَیری' لفظ کی برابری کر سکے۔ کیسے کیسے رنگ گھلے ہیں اس لفظ میں۔ ایسا ہی ایک نقطہ ہے جُلمی اس لفظ کا استعمال بھی وسیم صاحب نے بڑے خوبصورت پیرائے میں کیا ہے۔

بھات چڑھے چولہے پہ دوار ہوئی کھٹ کھٹ
جُلمی نے گھر بھی سمجھ لیا پن گھٹ
کیسی لجا ہین چھون پاپی تیرے موسم کی
بدرا بدرا سیج سجاؤں دھوپ شرماؤں

اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے دیگر دیہی الفاظ کا بھی جذبات کی مناسبت سے مفید استعمال کیا ہے۔ جیسے، ہنڈیا میں کھچ پچ تو من میں بڑا سنکٹ۔

ان کے علاوہ ایک مقام پر 'چھن' لفظ کا کتنا خوبصورت استعمال ہوا ہے۔

بوند بدن کے انگارے پر گر کر چھن سے بولے

نظموں میں آہنگی صوت وصدا کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ آواز کو لفظوں میں جوں کا توں پکڑ لینے کا فن بھی کسی شاعر کو بڑا ثابت کرتا ہے۔ وسیم صاحب نے مندرجہ بالا سطور میں اس آہنگ 'کھٹ کھٹ'، 'کھچ پچ' اور 'چھن' کو جس طرح برتا ہے وہ قابل تعریف ہے۔

ہر زبان کا اپنا ایک محاورہ ہوتا ہے۔ جو شاعر زبان کے محاوروں سے جتنا واقف

ہوگا اسی اعتبار سے وہ بڑا شاعر مانا جائے گا۔ گیت کار وسیم صاحب اس زبان کے محاوروں سے بھی پوری طرح واقف ہیں۔ چند مثالیں دیکھیں—

کھیتوں کی ہریالی طعنے مارے ہنسی اڑائے

(طعنے مارنا، ہنسی اڑانا)

نیند کبھی آ بھی جائے تو جسم کا جادو جاگے

(جادو جاگنا)

آنکھ لگے تو خواب ستائے، خواب کھلے تو نیند نہ آئے

(آنکھ لگنا)

میرے پیار کی انگلی تھامے کل یگ بھی ست یگ ہو جائے

(انگلی تھامنا)

کوئی ہے اس میں راج دلاری کوئی بڑی کھل کھیلی

(کھل کھیلنا)

گلے گلے پانی آ پہنچا دیکھوں مجھ کو کون بچائے

(گلے گلے پانی آنا)

وسیم بریلوی کے گیتوں میں تمثیلات بھی بڑی معنی خیز ہیں اور کچھ تو اتنی نئی ہیں جو پہلے دیکھنے میں نہیں آئیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کریں—

بھیگی دھرتی کے انکر سا انگ انگ اترائے

کچی بال کی طرح مورا جسم جھکولے کھائے

سپنے جیسا پوون، اڑتی تتلی جیسا پیار

کھیت پڑا ہے گروی جیسے غیر کے گھر گھر والی

من بدرا سنگ پینگ بڑھائے تن میں بجری سی لہرائے

وسیم صاحب نے استعاروں کا بھی بہت موزوں استعمال کیا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کسی بھی شاعر کے تخیلات تمثیلوں اور استعاروں میں بھی دکھائی دیتے ہیں اور انہی سے شاعر کا قد متعین کیا جاتا ہے۔ وسیم صاحب نے اپنے گیتوں میں استعاروں نے نئے نئے رنگ بکھیر ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کریں

تن کی تپتی ریت پہ جیسے پھوار گرے شبنم کی

تو امبر کی آنکھ کا تارا میرے چھوٹے ہاتھ

جسم کا پیالہ سانسوں بھرے تو روپ کی مدیرا چھلکے

سناٹے کی چادر اوڑھے سوئے سگرا گاؤں

میرے پیار کی انگلی تھامے کل یگ بھی ست یگ ہو جائے

ارتھی کے رتھ پر ہی بیٹھ کے آئی ملن کی بیلا

ان استعاروں کے علاوہ ایک ایسا استعارہ بھی اپنے گیتوں میں ایک دو جگہ وسیم صاحب نے استعمال کیا ہے جو ہندوستانی پرُانک قصہ (پرانوں میں بیان کیا گیا قصہ) استعارے کا حسین سمبل بن کر آیا ہے اور یہ سمبل ہے 'لکشمن ریکھا'۔ لکشمن ریکھا وہ ریکھا

ہے جو حدود کا احساس دلاتی ہے۔ اس کا خوبصورت استعمال دیکھیں—

پیار کہے جا جا لاج کہے نہ جا
چھوٹی سی کٹیا بڑی مریادا
لکشمن کی ریکھا بھئی بابل کی چوکھٹ
تیری اور ہی دیکھا میں نے اپنی اور نہ دیکھا
جب جب بڑھنا چاہا پاؤں سے لپٹی لکشمن ریکھا
میں اپنے بھی ساتھ نہیں تھی تیرے دنیا ساتھ
سجن میں بھول گئی یہ بات

اسی طرح ان گیتوں میں صفات کا استعمال بھی نرالا ہے جس سے مقصدِ کلام اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ جیسے 'سنیاسی اَدھر'، 'پاپی چُمبن'، 'اُپواسی نین' وغیرہ۔ موضوعات کو کہیں کہیں انسانی قالب میں ڈھالنے کا عمل بھی ہوا ہے جو گیتوں میں مزید نکھار لے آتا ہے۔ جیسے—

دھوپ کی آڑ میں چھپ کر سورج بھیگے بال سکھائے

یہاں سورج کو اس روپ میں پیش کیا گیا ہے جیسے وہ کوئی انسان ہو۔ اسی طرح 'جوانی پیاس سے دامن دھوئے' میں جوانی کو بھی انسان کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ جہاں تک ان گیتوں کے تکنیک اور بحر کا سوال ہے، یہ گیت ایسے ہیں جن کے ٹکڑے دو دو مصرعے ہیں اور دونوں قافیے ملتے ہیں جیسے—

دھرتی کیسے ناج اگائے، امبر کیا پانی برسائے
میرا پیار نہ ہو تو ساجن دور تلک سوکھا پڑ جائے
چھوٹی چھوٹی خوشیاں اپنی چھوٹے چھوٹے غم

ہم کیا جانیں ستا دھرمی تیرے دین دھرم
بھات چڑھے چولہے پہ دوار ہوئی کھٹ کھٹ
جُلمی نے گھر بھی سمجھ لیا ہے پنگھٹ

اس طرح کچھ گیت ایسے بھی ہیں جن کے مکھڑے ڈیڑھ مصرعوں کے ہیں۔ پہلا ایک مصرع پورا ہے اور دوسرا مصرع آدھا ہے، لیکن قافیے دونوں میں ملتے ہیں ــــ

سپنے جیسا پَوَن، اڑتی تتلی جیسا پیار
کہیں مل جائے پھر اک بار
آنکھ کہے کہ دن نکلا ہے، دل یہ کہے ہے رات
بھلا میں مانوں کس کی بات
سکھیوں کی راتیں جاگیں، مورا دن بھی سوئے
جوانی پیاس سے دامن دھوئے

کسی شاعر کے بڑے ہونے کی پہچان یہ ہے کہ اس کے اشعار بطور حوالہ پیش کرنے کے لائق ہوں، ان میں 'تخلیقیت' ہو۔ اور یہ تخلیقیت تب ہی آتی ہے جب اس میں زندگی کا حسن وقبح اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ موجود ہو اور اسے کم سے کم الفاظ میں بلند آہنگ کے ساتھ پیش کیا گیا ہو جو ہمارے خیالات کو یا من کو جھنجھوڑ ڈالے۔

وسیم صاحب کے گیتوں میں یہ اہم صفت پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ ان کی چند مثالیں قابلِ دید ہیں ــــ

مرد کو پورا کرنے میں ہی عورت ہوئی ادھوری

مندر چپ ہے، مسجد چپ ہے، نفرت بول رہی ہے

جسم کو آگ لگانے پر مجبور ہے پیٹ کی آگ

ارتھی کے رتھ پر ہی بیٹھ کے آئی ملن کی بیلا

کس کے بس میں ساتھ دینا ہے کسی کا
کیا بھروسہ پھول جیسی زندگی کا

سوپن یہ سمجھو کہ دیکھے ہی نہیں تھے
عمر بھر رہتے وہ رشتے ہی نہیں تھے

اس بلا کا بوجھ پلکوں پر نہ ڈالو
آؤ آنسو پونچھ ڈالو

اس طرح عصری شعور ووجدان اور فکری تسلسل کے مختلف مراحل سے گزرنے والے وسیم بریلوی کے یہ گیت پوری مہارت فن اور حسنِ نگارش کے ساتھ ہندی شاعری کے اُفق پر نمودار ہوئے ہیں۔ ان کی سہل نگاری، سہج نگاری اور بھولا پن قاری اور سامع کو متوجہ کیے بغیر نہیں رہتا۔ ان کی قوتِ فکر، ان کا اندازِ آرائش ان کا اصول نظم اور ان کی زبان کا بلند معیار اس قسم کا ہے کہ ایک ان پڑھ آدمی بھی پڑھے لکھے شخص کی مانند انہیں بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ ان کے گیتوں کی دل کشی انھیں زد زبان خاص وعام کرنے معاون ثابت ہوتی ہے وہ اتنے سہل ہیں جیسے کہ ہماری سانسیں، وہ اتنے حسیں ہیں جیسے کہ گلاب کی پنکھڑیاں، وہ اتنے مترنم اور نغمگی سے بھرے ہوئے ہیں جیسے لہروں کا مدوجزر، وہ اتنے وسیع ہیں جتنا کہ ہفت افلاک، وہ ایسے رس سے بھرے ہیں جیسے آبِ حیات، وہ ایسی مہک لیے ہوئے ہیں جیسے کہ

سوندھی مٹی کی خوشبو، وہ ایسے پُرلحن ہیں جیسے کہ دل کی دھڑکن، وہ ہمیں ایسے چھو جاتے ہیں جیسے کہ ہوا کا جھونکا۔ یہ گیت گیت نہیں بلکہ ہمارے تن من اور روح کو تسکین بخشنے والے خدائی عطیے ہیں۔

'آنسو لفظ اور پھیلتے رنگ'

غزل میری ذاتی جذباتی تربیتی مجبوری رہی تو نظم تہذیبی دائروں میں رہ کر خود سے بے تکلف ہونے کی آرزو اور گیت بچپن کے گاؤں کی خفیہ آنکھ مچولیوں کی دھما چوکڑی کے کبھی نہ بھلائے جانے والے بے ضرر لمحات کی رومان انگیز رومانی بازیافت۔کل ملا کر زندگی کے ہلکے گہرے رنگ کسی نہ کسی فارم میں آپ سے میری اپنی زبان اور اپنے انداز میں بات کرتے نظر آنا چاہتے ہیں۔میرے نزدیک کوئی بھی تجربہ ارزاں یا بے وقعت نہیں۔بس پیش کرنے کا سلیقہ ضروری ہے۔جس کیفیت نے جس رنگ میں ڈھلنا چاہا اسے وہی کینوس دینے کی کوشش کی۔فارم میرے لئے مسئلہ نہیں رہا۔ہاں کنٹینٹ ضرور میری اولیت تھا، ہے اور رہے گا لہٰذا جو بات غزل نہ کہہ سکی اس کے لئے نظم کا سہارا لینے میں تامل نہیں کیا۔جو کیفیت دونوں کے دائرہ اختیار سے باہر دکھی اسے گیت میں ڈھالا۔گیت پر بڑے چیں بہ جبیں ہوئے 'شہ کے مصاحب' مگر میں کیوں مرعوب ہونے لگا زمینداری کی روٹی کھا کر بچپن سے زمینداری کو استحصال بے جا کی ملامت سمجھنے والا۔نتیجہ میں نشۂ خودرائی کے کھوکھلے پن سے منتشر بزرگوں کی جھڑکیوں اور ڈانٹوں کا حقدار بننے والا باغی ذہن بھلا ارباب اقتدار ادب کے چیں بہ جبیں ہونے کو کیا خطرے میں لاتا۔سامنے ہندی نو گیت تو تھا ہی۔اس سے بڑھ کر اودھی اور برج لوک گیت کا جیتا جاگتا جادو تھا جو سر کیا روح چڑھ کر

بولتا ہے۔ یوں بھی غزل شہری تہذیب کی ترجمان تھی — ہر شہر سے کچھ ہی دور پر بسنے والے دیہاتوں کا پھیلاؤ تو اس مہذب صنف سخن کا موضوع ہی نہ تھا۔ ان بھولے بھالے دیہاتوں میں بسنے والوں کے پاس معصوم جذبوں کے اتار چڑھاؤ کی کیسی بڑی کائنات تھی۔ موسم رنگ برنگے تھے۔ میلے ٹھیلے تھے۔ دھول میں لپٹی پگڈنڈیاں تھیں۔ جھولے پڑے آم کے باغ تھے تال تلیہ تھے۔ چوگڑے تھے۔ نہریں تھیں۔ کوئل کی کوکو تھی۔ چڑیوں کی بے خوف زباں درازیاں تھیں کھرے جسموں کی بے دریغ جولانیاں تھیں۔ بے باک الھڑ پن کی ان بوجھی مستیاں تھیں۔ بوڑھوں کی چلموں کے دھوئیں سے اٹھتی توانا کھانسیاں تھیں۔ محنت مٹی سنے بچوں کی بے پروا محرومیاں تھی۔ بھولے بھالے غم چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں۔ کیا تھا۔ جو لوک سنسکرتی کے پھیلاؤ کے پاس نہیں تھا۔ کاش اردو سنجیدگی سے اس طرف متوجہ ہوئی ہوتی تو موضوعاتِ فکر ونظر کی ایک نئی کائنات کی جلوہ سامانیاں اس کے دامن کی زینت بن گئی ہوتیں بے چارے نظیر زمینی ہوئے تو آسمان ادب والوں نے انھیں بے زمیں سمجھا۔ پہلے تو لائق ذکر تک نہ ٹھہرے۔ بھلا ہو شعور نو کا جس نے انھیں ڈھونڈ نکالا۔ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ غزل کا شہری مزاج اگر ذرا بھی زمینی کھر درے پن کے لئے نرم ہوا ہوتا تو غزل ہندوستانیت کے دل تک جا پہونچتی۔ میں نے تو ان گیتوں کو عوام وخواص کی محفلوں میں پیش کرتے ہوئے یہی اندازہ لگایا کہ بڑے سے بڑا شہری کلچر کا دلدادہ بھی اپنے دل کے کسی نہ کسی کونے میں وہ چھوٹا سا گاؤں ضرور لئے پھرتا ہے جہاں اس کے بچپن نے مٹی میں لوٹنا تال تلیوں میں اچھلنا کودنا سیکھا ہے۔ پاکستان کا کراچی لاہور ہو، دبئی، سعودی عرب یا امریکہ کا نیویارک، یا واشنگٹن ایک بار سامعین گیت کی بھرپور کیفیت

سے ہم آہنگ ہوئے تو از خود رفتہ ہوئے بغیر نہ رہے۔ گیت لفظی کاریگری بندش کی چستی یا ترکیب بندی کے مروجہ تقاضوں کی زد میں آنے کے بجائے کیفیت کے ساز سے نکلنے والا وہ سُر ہے جو تکلف و تصنع سے بے نیاز جذبوں کی بے سروسامانی کو بھاشائی معصومیت کے حوالے کر دینے کا جادو جگاتا ہے۔ غزل میں اگر مرد کا جذبہ عشق عورت سے ہم کلام ہوتا ہے تو گیت کی روایت عورت کے بے پناہ پیار کو مرد پر نچھاور کرتی نظر آتی ہے۔ اور عورت کے اظہار محبت میں جو نرمی خود سپردگی احساس کم مائیگی سب کچھ کھو کر بھی سب کچھ پا جانے کی خود اعتمادی ہے وہی گیت کے لہجے کی گنگناتی غنائیت بنتی ہے۔ کیسی کیسی معنوی گرہیں چھوٹے چھوٹے جذبوں کے اظہار میں کھلتی ہیں اشاروں اشاروں میں کیا کیا نفسیاتی اتار چڑھاؤ بیان ہو جاتے ہیں۔ کیسے کیسے دھنک رنگ موسم جسمی جمالیات کے آنگن اترتے ہیں ذرا گیت کی لے میں کھو کر بوجھیے۔ اور جسم سے روح تک کے سفر کی بھول بھلیّوں میں کھو کر دیکھیے۔ ایک اور ہی دنیا آپ سے مخاطب نظر آئے گی۔

رہی بات نظم کی تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ تہذیبی دائروں مین رہ کر جب خود سے بے تکلف ہونے کو جی کیا ہے تو غزل کے بجائے نظم کا دامن پکڑا ہے۔ اردو کے پاس نظم کی بڑی روایت ہے۔ غزل اشاروں چلتی ہے تو نظم وضاحتوں کا تسلسل ہے۔ لحاظ واحتیاط جب اختیار سے باہر ہونے لگیں تو اشارے گھٹن بن جاتے ہیں۔ پھر کھل کر رو لینے سے جی بھی تو ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہی احساس آپ سے بات کرے تو سمجھیے میری بات غلط نہیں۔ کچھ نظمیں ذاتی ہیں کچھ واقعاتی تو کچھ رومانی اور موضوعاتی۔ مگر ہر جگہ کچھ کہنے کی مجبوری نظر آئے تو سمجھیے میں نے خود سے بھی انصاف کیا ہے آپ سے بھی۔ احساس کی سچائی اور خلوص کی

گہرائی شاید آپ کو متوجہ کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اگر آپ شریک حال بن کر غور کریں گے تو بکھری سوچوں کی ایک منھ بولتی دنیا آپ سے مخاطب ملے گی۔ انسانی ذہن کیسی کیسی نفسیاتی الجھنوں جذباتی بکھراؤ کے مرحلوں سے گذرتا ہے۔ اس کا اعمال نامۂ فکر ونظر کیسے کیسے بکھرے رنگوں کی گرفت میں رہتا ہے۔ اس سب کا ہلکا گہرا تاثر آپ کو ان نظموں میں نظر آنا چاہئے۔ ہر نظم آپ کو کہیں چھیڑے۔ گدگدائے سنجیدہ کردے یا غمگین تو سمجھیں میں کہیں نہ کہیں آپ سے جذباتی وفکری سطح پر دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔ یہ ہاتھ آپ نے محبت سے تھام لیا تو شاید بہت دیر اور بہت دور تک میں آپ سے خراج رفاقت وصول کرتا رہوں گا۔

وسیم بریلوی

فہرست

سلیقہ ہی نہیں شاید اسے محسوس کرنے کا
جو کہتا ہے خدا ہے تو نظر آنا ضروری ہے

کیسی بے سمتیاں تھیں تمہارے بغیر
کوئی رستہ کہیں کو نکلتا نہ تھا

فن کار

یہ عارض ترے جیسے بوسیدہ قبریں
یہ عارض ترے بوسہ گاہِ حوادث
جو شاداب رہتے
تو اوراقِ دوراں
ہزاروں فسانوں سے محروم رہتے

کھلونا

دیر سے ایک نا سمجھ بچہ
اک کھلونے کے ٹوٹ جانے پر
اس طرح سے اداس بیٹھا ہے
جیسے میت قریب رکھی ہو
اور مرنے کے بعد ہر ہر بات
مرنے والے کی یاد آتی ہو
جانے کیا کیا ذرا توقف سے
سوچ لیتا ہے اور روتا ہے
لیکن اتنی خبر کہاں اس کو
زندگی کے عجیب ہاتھوں میں
یہ بھی مٹی کا اک کھلونا ہے

پرانا پیپل

لاکھوں سال پرانا پیپل
جس کی لمبی لمبی شاخیں
صدیوں کی بانہوں میں اپنی
باہیں ڈالے جھوم رہی ہیں
اور یہ عمر رسیدہ پیپل
جس کے نیچے آگ لگی ہے
گردن ڈالے سوچ رہا ہے
کیا یہ جلنا ہی جینا ہے
لمحہ لمحہ پتے گرکر
آگ کا ایندھن بن جاتے ہیں
قرنوں سے یہ نازک پتے
شعلے بنتے، بجھتے رہے ہیں
میں بھی اس پیپل کی لمبی
شاخ پہ لرزاں اک پتہ ہوں
من ہی من میں سوچ رہا ہوں
کب سے لپٹیں گھور رہی ہیں
میری باری کب آئے گی

میری زمیں

میری ، زمیں پیاری زمیں
تو آسماں سے ہے بڑی
جس کی بلندی کی کشش
اچھی تو ہے سچی نہیں
لیکن یہ تیرا وہم ہے
میں تجھ سے کٹ کر بھی کبھی
سمتِ سفر چھو پاؤں گا
تو جب بھی چاہے تھام لے
یہ پاؤں جن سے ہیں سفر
کے فاصلوں میں جرأتیں
سب کچھ تو تیرے دم سے ہے
میری زمیں پیاری زمیں
تو تو مری رفتار ہے
قدموں کی پہریدار ہے
تو ہی مرا اظہار ہے
تو ہی مری غم خوار ہے
میری زمیں پیاری زمیں

وہ جانتے ہی نہیں

میں تم سے چھوٹ رہا ہوں مرے پیارو
مگر مرا رشتہ پختہ ہو رہا ہے اسی زمیں سے
جس کی گود میں سمانے کے لئے
میں نے پوری زندگی ریہرسل کی ہے
کبھی کچھ کھو کر کبھی کچھ پا کر
کبھی ہنس کر کبھی رو کر
پہلے دن سے مجھے اپنی منزل کا پتہ تھا
اسی لئے میں کبھی زور سے نہیں چلا
اور جنھیں زور سے چلتے دیکھا
ترس کھایا ان کی حالت پر
اس لئے کہ وہ جانتے ہی نہ تھے
کہ وہ کیا کر رہے ہیں

بے نام کسک

سسکتے نور کو کاندھا دیئے دیئوں کی لویں
نگاہ سوز اندھیروں میں کانپتے سائے
سیاہ رات سے لپٹی سیاہ خاموشی
نفس نفس میں سلگتا ہوا نسوں کا بخار
لبوں سے اٹھتی ہوئی پیاس کی وہی لپٹیں
جو زندگی کے تموّج کے ساتھ جیتی ہیں
تمام جسم میں اک سنسنی کی کیفیت
کہ جیسے شمع کے دونوں سرے جل اٹھے ہوں
بھڑکتے آنکھ کے شعلوں سے نیند کوسوں دور
دہکتی آگ میں لپٹا ہوا تمام وجود
برہنہ جسم کھڑی ہے گناہ کی دیوی
اور اس طرح سے مخاطب ہے جیسے میرے لئے
یہ انگ انگ شرارہ بنا کے لائی ہے
سزا جزا کے تصور مجھے بہکنے دے
اسی بہکنے سے جینا مرا عبارت ہے
گناہگار نہ ہونا خلاف فطرت ہے

ادنیٰ سا باسی

کل بھی میری پیاس پہ دریا ہنستے تھے
آج بھی میرے درد کا درماں کوئی نہیں
میں اس دھرتی کا ادنیٰ سا باسی ہوں
سچ پوچھو تو مجھ سا پریشاں کوئی نہیں
کیسے کیسے خواب بنے تھے آنکھوں نے
آج بھی ان خوابوں سا ارزاں کوئی نہیں
کل بھی میرے زخم بھنائے جاتے تھے
آج بھی میرے ہاتھ میں داماں کوئی نہیں
کل میرا نیلام کیا تھا غیروں نے
آج تو میرے اپنے بیچے دیتے ہیں
سچ پوچھو تو میری خطا بس اتنی ہے
میں اس دھرتی کا ادنیٰ سا باسی ہوں

یہ امید نہ تھی

چند لمحے مگر قیامت کے
منظروں کو سمیٹتے وقفے
ٹوٹتے چاند ڈوبتے سورج
دن کے آنگن میں رات کے سائے
پھول سے خواب دیکھتی آنکھیں
کھوگئیں خوف کے اندھیروں میں
زندگی بھاگ کر کہاں جاتی
موت نے راستہ دیا ہی نہیں
اے زمیں اے ہماری دھرتی ماں
ہم ترا احترام کرتے ہیں
تیرا دم صبح وشام بھرتے ہیں
اتنا کہنے کی بس اجازت دے
ہم خطا وار چاہے جتنے ہوں
ایک ماں سے تو یہ امید نہ تھی

جیکولین کینیڈی اور اوناسس کی شادی سے متاثر ہوکر

وہ شام کتنی بھلی تھی کہ تیرے غم میں شریک
ہر ایک بھیگی ہوئی آنکھ کا دلاسا تھا
یہ شام کتنی عجب ہے تری خوشی میں شریک
سوائے تیرے زمانے کا کوئی فرد نہیں
میں اس تضاد کے بارے میں سوچتا ہی رہا
کہاں وہ حسنِ تمنا کہاں یہ رسم طلب
گمان ہوتا ہے جیسے کوئی حسیں تصویر
زمیں پہ آن رہی ہوفریم سے گر کر
اور اس پہ ٹوٹا ہوا شیشہ طنز کرتا ہو
مگرقصور نہ تیرا نہ تیرے خوابوں کا
قصور ان اہل پرستش کا ہے کہ جیکو لین
جو کم نگاہ تجھے پدمنی سمجھ بیٹھے
یہ بھول کر کہ ترا جسم ایک شعلہ ہے
جسے جلانے کی خاطر ہی جلنا آتا ہے
یہ بھول کر کہ ترے جسم میں اک عورت تھی
جو اپنے سائے کو منزل سمجھ نہیں سکتی

۱۵/اگست

میں نے ہر بار یہ سوچا کہ یہ بے باک قلم
آج کے دن تو وہ لکھے جو زمانہ چاہے
درد کی شام کو خوشبو کا سویرا لکھے
پیاس کے دشت کو بہتا ہوا دریا لکھے
زہر نفرت کو ضمیروں کو مسیحا جانے
سنگ ریزوں کو گہر خون کا صہبا جانے
کھیت سے بھوک اُگے دانۂ گندم جانے
آنکھ کے اشک کو اک موج تبسم جانے
چور بازار میں سچائی کو بکتا دیکھے
آدمیت کو ہر اک موڑ پہ تنہا دیکھے
میں نے ہر بار یہ سوچا کہ یہ بے باک قلم
آج کے دن تو وہ لکھے جو زمانہ چاہے
لیکن اس بار بھی یہ باغی و خود دار قلم
مجھ سے کہتا ہے مرے خوابوں کا سودا نہ کرو
میرے احساس کی سچائی کو رسوا نہ کرو

یہ فضا بدلے تو میں گاؤں گا مسکاؤں گا
لوگ بدلیں گے تو میں خود ہی بدل جاؤں گا
ورنہ ہر وقت کے سیلاب سے ٹکراؤں گا
ٹوٹ جاؤں میں کم ظرف نہ کہلاؤں گا

وہ پاؤں

(پنڈت جواہر لال نہرو کے سورگ واش سے متاثر ہو کر)

یہ فکر مند منازل یہ غمزدہ راہیں
یہ سوچتی ہیں کہ ایسے بھی پاؤں تھکتے ہیں
جو اٹھ گئے تو زمانے کی اٹھ گئیں آنکھیں
گزرتے وقت نے سینے میں روک لیں سانسیں
وہ پاؤں جن کو ٹھہرنے کا تجربہ ہی نہ تھا
جو کائنات کی نبضوں کے ساتھ چلتے تھے
جو آندھیوں میں چراغوں کی طرح جلتے تھے
جیا ہے جن سے ترقی کی مانگ کا سیندور
ہمیشہ ساتھ چلا جن کے رہبری کا شعور
کیا جنھوں نے مرتب حیات کا دستور
وہ پاؤں جن سے طریق مسافرت بدلا
نقوش جن کے ستاروں کی طرح صدیوں تک
فلک کی تیرہ فضائی کے کام آئیں کے
جو راہ دیکھتا ان فاصلوں کو چھوڑ گئے
جو آدمی نے بنائے ہیں آدمی کے لئے

وہ پاؤں نصف صدی جن کو جاگتے گذری
وہ پاؤں آج بڑی گہری نیند سوئے ہیں
کسی بہانے جو اب ٹوٹ بھی نہیں سکتی
یہ فکر مند منازل یہ غمزدہ راہیں
یہ سوچتی ہیں کہ ایسے بھی پاؤں تھکتے ہیں

سیاست کے نام

ہم نے لفظوں کو اعتبار دیا
تم نے جیتے جی ان کو ماردیا
ہم نے دل جوڑنے کا کام کیا
تم نے ذہنوں کو انتشار دیا
ہم نے بس پیار بانٹنا چاہا
تم نے نفرت کا کاروبار کیا
کاش تم کو کوئی بتادیتا
تم نے ذہنوں کو جو غبار دیا
ایک کرسی ضرور جیت گئے
تم نے ہندوستان ہار دیا

۳۱ر اکتوبر ۱۹۸۴ کی غمگین شام کے نام

وہ ایک پھول کی پتی گلاب کی خوشبو
ہزار کانٹوں میں رہ کر جو مسکراتی تھی
جو آندھیوں کے مقابل دیئے جلاتی تھی
زمیں کو پھول بنانے کا اہتمام رہا
تمام عمر جسے زندگی سے کام رہا
وہ ایک پھول کی پتی گلاب کی خوشبو
بکھر کے رہ گئی اس اعتبار کے ہاتھوں
جسے بنانے میں صدیوں کا حوصلہ درکار
جسے گنوانے میں لمحوں کی گمرہی کافی
وہ ایک پھول کی پتی گلاب کی خوشبو
کچھ ایسے بکھری کہ آنسو پہ اختیار نہیں
کچھ ایسے بکھری کہ آنکھوں پہ اعتبار نہیں
کچھ ایسے بکھری کہ ماحول سوگوار لگے
یہ سارا باغ ہی جیسے گناہگار لگے

ٹوٹے رشتے

مرے ٹوٹے ہوئے رشتو
مری مجبوریاں سمجھو
زمانے کے تشدد سے مجھے آگاہ کرتے ہو
مگر میں وہ نہ کہنے پر بھلا کس طرح شرماؤں
جسے کہہ کر
میں اپنی خلوتوں کا چور بن جاؤں

شہر میرا

شہر میرا اداس گنگا سا
کوئی بھی آئے اور اپنے پاپ
کھو کے جاتا ہے دھو کے جاتا ہے
آگ کا کھیل کھیلنے والے
یہ نہیں جانتے کہ پانی کا
آگ سے بیر ہے ہمیشہ کا
آگ کتنی ہی خوفناک سہی
اس کی لپٹوں کی عمر تھوڑی ہے
اور گنگا کے صاف پانی کو
آج بہنا ہے کل بھی بہنا ہے
جانے کس کس کا درد سہنا ہے
شہر میرا اداس گنگا سا

یہ اپنا شہر

یہ اپنا شہر یہ باتوں یہ بول چال کا شہر
خموشیوں کے سمندر سے جاملا کیسے
نہ قہقہے نہ وہ بے باک دوستی کے نشاں
دلوں کے درمیاں یہ فاصلہ ہوا کیسے
نہ جانے کس کی نظر لگ گئی کہ ہر رونق
کھڑی ہے سڑکوں پہ اوڑھے ہوئے وہ سناٹے
جو راہگیروں سے وشواس چھین لیتے ہیں
حسین پھولوں سے بو باس چھین لیتے ہیں
جو بھوک چھینتے ہیں پیاس چھین لیتے ہیں
تیاگ والوں سے سنیاس چھین لیتے ہیں
عجب ہوا ہے کہ چوراہے چھوڑ چھوڑ کے لوگ
مڑے ہیں تنگ اندھیری سی اس گلی کی طرف
جو راہ دیتی نہیں راہ روک لیتی ہے
نظر کے سامنے پھیلاؤ تھا زمانے کا
مگر دلوں کو سمٹنا پسند آیا ہے
کھلی ہواؤں میں گھٹنا پسند آیا ہے

جو دینے والے نے اس زندگی کے ساتھ ہمیں
گذارنے کا سلیقہ بھی دے دیا ہوتا
تو اپنا شہر یہ باتوں یہ بول چال کا شہر
اداسیوں کی طرح بے لباس کیوں ہوتا
حواس رکھتے ہوئے بدحواس کیوں ہوتا

شہیدوں کے نام

محبت کے چراغوں کو دھواں ہونے نہیں دینا
زمیں کے کنکروں کو آسماں ہونے نہیں دینا
گلابوں کی مہک کو بے زباں ہونے نہیں دینا

محاذ جنگ سے رہ رہ کے یہ آواز آتی ہے
شہیدوں کے لہو کو رائیگاں ہونے نہیں دینا

جو راتوں سے ملی ہو اس سحر سے فاصلہ رکھنا
کھلے دل کی ملاقاتوں سے شرکا فاصلہ رکھنا
جو آنکھوں کولڑا دے اس نظر سے فاصلہ رکھنا

محاذ جنگ سے رہ رہ کے یہ آواز آتی ہے
شہیدوں کے لہو کو رائیگاں ہونے نہیں دینا

بس اک انصاف کی شمعیں جلیں گھر گھر اجالا ہو
ہماری نیک نامی کا جہاں میں بول بالا ہو
خریدے وہ نہ ہم کو جس نے خود کو بیچ ڈالا ہو

محاذ جنگ سے رہ رہ کے یہ آواز آتی ہے
شہیدوں کے لہو کو رائیگاں ہونے نہیں دینا

سمندر کی حدیں طے ہوں کوئی پیاسا نہ رہ جائے
اندھیروں کے اشاروں پر دیا جلتا نہ رہ جائے
ہمارے جان دینے کا بس اک قصہ نہ رہ جائے

محاذ جنگ سے رہ رہ کے یہ آواز آتی ہے
شہیدوں کے لہو کو رائیگاں ہونے نہیں دینا

ایک درد

کھلی مجھ پر ہی لوگوں کی زباں ہے تو غلط کیا ہے
مرے چاروں طرف پھیلا دھواں ہے تو غلط کیا ہے
سفر میں چلتے چلتے اس طرح گمراہ ہونے پر
خفا مجھ سے مرا ہی کارواں ہے تو غلط کیا ہے
جب اس گھر کی ہی اک دیوار بنیادوں سے روٹھی ہو
مرا ہمسایہ مجھ سے بدگماں ہے تو غلط کیا ہے

ایک درد

یہی حالات ہیں تو دیکھنا ہیں دن برے ہم کو
گھروں کو بند کر لیں گے پڑوسی دیکھ کے ہم کو
جہاں وشواس اٹھ جائے وہاں کچھ بھی نہیں رہتا
کہاں لے جائیں گے آخر یہ بڑھتے فاصلے ہم کو
یہاں اپنوں کی نادانی نے وہ کانٹے بچھائے ہیں
کہ اب شک کی نظر سے دیکھتے ہیں راستے ہم کو

بنجارن

چند خیمے نصب ہیں اک سردیوں کی رات ہے
شہر سے کچھ دور ہے خانہ بدوشوں کا پڑاؤ
ٹمٹماتے ہیں دیئے خیموں کے اندر شام سے
مفلسی کے تنگ حلقے میں سلگتے ہیں الاؤ

چند بنجارے خلاف شرع جسموں کو چرائے
آگ حلقے میں لئے بیٹھے ہیں اس ترکیب سے
پھول کے چاروں طرف اخذ حرارت کے لئے
جیسے کچھ کانٹے نکیلے اور بے ترتیب سے

دن کی محنت کا نتیجہ رات کٹنے کا سوال
اٹھ رہا ہے بن کے ان چولہوں کے سینے سے دھواں
جن کی صحبت میں قبیلے کی کنواری لڑکیاں
تجربے دن بھر کے کرتی ہیں نگاہوں سے بیاں

لیکن آج ان کی زبانیں بند سرِ غم سے نگوں
ہر نظر دل میں لئے بیٹھی ہوئی ہے اک سوال
عورتیں خاموش مردوں کی زبانیں لا جواب
حادثہ ہے ایک لیکن مختلف سے ہیں خیال

اس قبیلے کی کوئی نو عمر لڑکی صبح سے
قینچیاں لے کر گئی تھی بیچنے کے واسطے
شہر کی ان کوٹھیوں، اونچے مکانوں کی طرف
سنتری روکے کھڑے رہتے ہیں جن کے راستے

کوٹھیاں وہ جن کے چہرے گرد سے واقف نہیں
جن کے سینوں میں جوانی کی اٹھانیں دفن ہیں
ظاہرا یہ کوٹھیاں خاموش رہتی ہیں مگر
ان کے کمروں میں ہزاروں داستانیں دفن ہیں

لیکن اتنی رات ہونے آئی اور لوٹی نہیں
جانے بیچاری پہ کیا گذری یہ سب کو فکر ہے
ایک بنجارن قبیلے بھر کی عزت کا سوال
وہ بڑی خود دار تھی یہ ہر زباں پر ذکر ہے

ایک کہتا ہے چلو تھانے میں چل کر بول دیں
دوسرا کہتا ہے پہلے بھی گئے تھے کیا ہوا
سیٹھ بھی شہروں کے ہیں شہروں کے تھانیدار بھی
سب کو آتا ہے ہماری آبرو سے کھیلنا

مفلسی میں جو ہر ناموس کی قیمت نہیں
چیتھڑوں میں ہو اگر عصمت تو پھر عصمت نہیں

شہر کے تہذیب داروں کی نظر میں بھائیو!
اک غریب انسان کی عزت کوئی عزت نہیں

قمقوں کی دسترس میں جگمگاتی کوٹھیاں
چھن رہی ہے جن کے پردوں سے اندھیری روشنی
ہم غریب انسان گھبراتے ہیں اس احساس سے
بڑھ کے خیموں تک نہ آجائے یہ ان کی روشنی

بوڑھے بنجارے کی یہ تقریر اور یہ حادثہ
شہر کے کم ظرف انسانوں پہ دل رونے لگا
کس قدر غمگین تھا میں گھر پہونچنے پر وسیم
جانے کتنے مسئلے پہلو میں لے کر سوگیا

صبح کو اخبار کی سرخی پہ نظریں جم گئیں
سیٹھ دامو در کے کوٹھی پر بھیانک مشغلے
ایک بنجارن تحفظ کرتے کرتے جسم کا
اوپری منزل سے گر کر مرگئی کل چھ بجے

خواب نہیں دیکھا ہے

میں نے مدت سے کوئی خواب نہیں دیکھا ہے
رات کھلنے کا گلابوں سے مہک آنے کا
اوس کی بوندوں میں سورج کے سما جانے کا
چاند سی مٹی کے ذروں سے صدا آنے کا
شہر سے دور کسی گاؤں میں رہ جانے کا
کھیت کھلیانوں میں باغوں میں کہیں گانے کا
صبح گھر چھوڑنے کا دیر سے گھر آنے کا
بہتے جھرنوں کی کھنکتی ہوئی آوازوں کا
چہچہاتی ہوئی چڑیوں سے لدی شاخوں کا
نرگسی آنکھوں میں ہنستی ہوئی نادانی کا
مسکراتے ہوئے چہرے کی غزل خوانی کا
تیرا ہوجانے ترے پیار میں کھو جانے کا
تیرا کہلانے کا تیرا ہی نظر آنے کا
میں نے مدت سے کوئی خواب نہیں دیکھا ہے
ہاتھ رکھ دے مری آنکھوں پہ کہ نیند آجائے

بے بسی

وقت کے تیز گام دریا میں
تو کسی موج کی طرح ابھری
آنکھوں آنکھوں میں ہوگئی اوجھل
اور میں ایک بلبلے کی طرح
اسی دریا کے اک کنارہ پر
نرکلوں کے مہیب جھاڑے میں
ایسا الجھا کہ یہ بھی بھول گیا
بلبلے کی بساط ہی کیا تھی

کیا سوچا

تم ابھی تھوڑی دیر ہی پہلے
سامنے سے مرے گذرتے ہوئے
دفعتۃً پورے جسم سے جھجکیں
مجھ کو ایسا لگا کہ نظروں کی
سطح پر میری، ایک تاج محل
جس طرح زلزلہ بداماں ہو
یہ تو میرا خیال تھا لیکن
میرے بارے میں تم نے کیا سوچا

بے بضاعتی

میں ایک راہگذر تھا جو چند لمحوں کو
کسی کے پاؤں کی آہٹ ملے تو جی اٹھے
نقوشِ پا سے امیدوں کی مانگ بھر ڈالے
میں اک شمع تھا جو آندھیوں کے جھونکوں کو
رفیق عمر سمجھ کر تمام شب کاٹے

مبارکباد

قلم اک اجنبی انداز میں مجھ سے یہ کہتا ہے
مبارکباد دینا چاہتا ہوں بولو کیا لکھوں
اسے تم سے تو محو گفتگو رہنے کی عادت ہے
تمہاری گرم سانسوں میں ہی جب اس کی عبارت ہے
تو پھر بولو یہ آخر کیوں شرارت خیز لہجے میں
مبارکباد دینے کے لئے الفاظ مانگے ہے

ایک نظم

دیوالی کی رات آئی ہے تم دیپ جلائے بیٹھی ہو
معصوم امنگوں کو اپنے سینے سے لگائے بیٹھی ہو
تصویر کو میری پھولوں کی خوشبو میں بسائے بیٹھی ہو
آنکھوں کے نشیلے ڈوروں پر کاجل کو بٹھائے بیٹھی ہو
میں دور کہیں تم سے بیٹھا اک دیپ کی جانب تکتا ہوں
اک بزم سجائے رکھی ہے اک درد جگائے رکھتا ہوں
خاموشی میری ساتھی ہے اور دیکھنے والا کوئی نہیں
اے کاش کہیں سے آجاتے جینے کا بہانہ کوئی نہیں

رخصتی

جاؤ بن جاؤ کسی ناآشنا کا اعتبار
آج سے مجبور ہو تم چھن رہے ہیں اختیار
آج سے تم اک نئے دل کی امانت بن گئیں
آج سے گذروگی خود اپنی تمناؤں پہ بار
کون الھڑپن کو سمجھے گا جوانی کا مزاج
کون ڈھونڈے گا تمہاری بے رخی میں انکسار
اس قدر تنہائیوں میں غرق رہنا چاہوگی
دل کی دھڑکن بھی تمہیں گذرے گی اکثر ناگوار
تم بھی ان کلیوں کے افسانوں میں رکھی جاؤ گی
جن کے احساسات کی دشمن ہے خود ان کی بہار
کون دیکھے گا اشاروں میں اشاروں کے سوال
کون سمجھے گا تمہاری گفتگو کا اختصار
مسکراؤ گی مگر ایسے مسافر کی طرح
راستے میں لٹ گیا ہو جس کا اک منزل سے پیار
کالی راتیں جذب کرلیں گی تمہارے اشک بھی
مسکرائے گا تمہارے حال پر صبرو قرار

روٹھنے کو کون سمجھے گا منانے کا پیام
کون جانے گا تمہاری بے بسی کا اختیار
زندگی کا دوسرا رخ ہے تمہارے سامنے
مصلحت ہے مان لو اب حال سے ماضی کی ہار

خودکشی

خامشی اور شب کا سناٹا
ایک میں ایک تیز رو دریا
گھونسلوں میں چھپے ہوئے پنچھی
دل لرزتا ہوا پرندوں کا
دور سادھو کی ایک کٹیا میں
جل رہا ہے دیا مگر چپ ہے
کس قدر بے حسی کا جینا ہے
نوحہ جاری ہے نوحہ گر چپ ہے
کون سا درد ہے جسے دل میں
لے کے تنہائیوں میں آتا ہوں
یہ مقامات سوچتے ہوں گے
روز آتا ہوں لوٹ جاتا ہوں
آج اک سال ہوگیا خالد
جب اسی گومتی کے پانی کو
تم نے پھولوں کی سیج سمجھا تھا
اور ٹھکرادیا جوانی کو

فکر روزی مآل خود داری
ایک کنبے کی زندگی کا سوال
چھوٹے بھائی کی چھوٹتی تعلیم
چھوٹی بہنوں کی شادیوں کا خیال
پیار کرتی رہی مگر شمسہ
تم سے عہدو فا نبھا نہ سکی
مفلسی ایسا ایک شعلہ تھی
جس کو کوئی ہوا بجھا نہ سکی
جان لیوا تھے سارے غم خالد
میں نے مانا کہ تم پریشاں تھے
لیکن اے دوست کیسے بھول گئے
تم بہرحال ایک انساں تھے
تم نے اچھا نہیں کیا ساتھی
خود کشی کو علاج غم سمجھا
موت کی برتری کو مان لیا
اور اک زندگی کو کم سمجھا
شمع جلتی ہے آندھیوں میں بھی

درد بن جاتے تم دلوں کے لئے
اس مسلسل جہاد میں خالد
تم کو جینا تھا دوسروں کے لئے
زندگی کی اداسیوں میں بھی
سوچنے کے لئے بہت کچھ تھا
سوچنے کے لئے بہت کچھ ہے
لیکن اب ہو تو کچھ نہیں سکتا

میری تصویر

وہ دن کہ تم نے مجھے پہلی بار دیکھا تھا
مجھے کہاں مری تصویر کو جو کانس پر
مری خموش کتابوں کے ساتھ رکھی تھی
'یہ کون ہیں' مری بہنوں سے تم نے پوچھا تھا

'انھیں تو لگتا ہے جیسے کہیں پہ دیکھا تھا'

جو اب ان سے تمہیں کیا ملا یہ تم جانو
مگر یہ کہتی تھیں تم بھی کہ ان کی جرأت پر
حیا کے بوجھ سے نظریں نہ اٹھ سکیں پھر بھی
زباں سے کچھ نہ کہا تم نے اس شرارت پر

ادا سے رکھ کے جھکی آنکھ پر ہتھیلی کو
شبہ میں ڈال دیا تھا ہر اک سہیلی کو

وہ دن کہ سارے زمانے کی آنکھ سے بچ کر
مرے خیالوں میں رہنے کی آرزو کی تھی
نظر کے سامنے تصویر رکھ کے راتوں کو
مری خموش نگاہوں سے گفتگو کی تھی

ہر ایک شعر کو خلوت میں گنگنایا تھا
خموشیوں میں ترنم مرا چرایا تھا

کسی بہانے سے آئیں تم اور آتی رہیں
وفا کے ساز پہ روحوں کا رقص ہوتا رہا
تکلفات اٹھے اور تم اجنبی نہ رہیں
حسین زلف کے سائے میں پیار سوتا رہا

قریب رہ کے محبت کی منزلیں سمجھیں
بہت سی راتیں بڑی احتیاط سے گذریں

مرا خیال کتابوں سے دور رہنے لگا
تمہاری یادیں مرا کافی وقت لینے لگیں
سہیلیاں تمہیں مغرور کہہ کے چھوڑ گئیں
تم اپنا وقت مری شاعری کو دینے لگیں

تمہاری آنکھوں میں چھپ کر سرور رہنے لگا
مجھے وفاؤں پہ اپنی غرور رہنے لگا

لبوں کا پاک تبسم لبوں کی حد میں رہا
دلوں کی باتیں نگاہوں تک آ کے لوٹ گئیں
تم ایک روز انوکھی سی احتیاط کے ساتھ
مری کھلی ہوئی بانہوں تک آ کے لوٹ گئیں

یہ ایک ایسی ادا تھی زباں سے کچھ نہ کہا
بس احترام سے بانہوں کو اپنی چوم لیا

مگر چراغ ہمیشہ کہیں نہیں جلتے
یہ زندگی ہے زمانے کے ساتھ چلتی ہے
خوشی کی عمر کا لمحے حساب کرتے ہیں
حسین ہو تو محبت نظر بدلتی ہے

یہ حادثات کہاں تک خلاؤں میں پلتے
کہاں تک اپنی محبت کے مشغلے چلتے

تمہاری پاک محبت پہ بدگماں نظریں
اٹھی ہوئی تھیں مگر پھر بھی آ رہی تھیں تم
تمہارے آنے میں وہ بے تکلفی نہ رہی
اب ایک رسم تھی جس کو نبھا رہی تھیں تم

بنی ہوئی تھیں محبت کا امتحاں نظریں
کس احتیاط سے اٹھتی تھیں بے زباں نظریں

تم امتحان کے ہر دور سے گذرتی رہیں
ادا سے شمعِ محبت مگر جلائے ہوئے
کچھ آرزوئیں محبت کی موت مرتی رہیں
مرے خیال کو ہر سانس میں چھپائے ہوئے

خموشیوں میں صداؤں کا رنگ بھرتی رہیں
تغیرات کی فطرت سے جنگ کرتی رہیں

تمہارے دل میں خموشی کی آگ جاگ اٹھی
مرے خیال میں ابھرے نئے نئے خاکے
ہمارے ماتھے کی شکنیں ابھر کے ڈوب گئیں
ہمیں نے مل کے بغاوت کے خواب بھی دیکھے

مگر زمانے کے آگے ہماری اک نہ چلی
جو اٹھ چکی تھی وہ آندھی دیئوں سے رک نہ سکی

تمہارے پاس شرافت کی پاسداری تھی
جسے زمانہ کوئی اہمیت نہیں دیتا
تمہارے پاس حیا کا حسین زیور تھا
جسے یہاں پہ کوئی مفت بھی نہیں لیتا

مرے خدانے دیا آدمی نے چھین لیا
تمہیں رواجوں کی شوخی نے مجھ سے چھین لیا

تمہارے گھر میں امارت کا اہتمام نہ تھا
کہ جس سے جسم کی بولی لگائی جاتی ہے
پھر ان ضمیر فروشوں کا تجربہ بھی نہ تھا
جو سود لیتے ہیں اولاد کی جوانی سے

خزاں سے دیتے ہیں جشنِ بہار کا بدلہ
وصول کرتے ہیں معصوم پیار سے قرضہ

زمانہ اپنے طریقوں پہ ناز کرتا ہے
میں دور رہنے پہ مجبور ہوگیا تم سے
رواج ورسم ومقدر کی پاسبانی میں
قریب آکے بہت دور ہوگیا تم سے

روایتوں کا گرایا ہوا سنبھل نہ سکا
قدم اٹھائے مگر اپنی راہ چل نہ سکا

یہ مختصر سی کہانی چلو تمام ہوئی
نئے سفر کو نیا دل بنا لیا تم نے
ان اعتبار فروشوں کی بستیوں سے دور
چراغ شام غریباں جلا لیا تم نے

سحر کی نور مزاجی سپردِ شام ہوئی
یہ مختصر سی کہانی چلو تمام ہوئی

مگر یہ روپ بدلنا تمھیں نہ راس آیا
تمہارے دل کو نئے مشغلے نہ جیت سکے
چراغ تیل کی قلت سے ٹمٹما اٹھا
طبیب آئے علاجوں کے بعد لوٹ گئے

رگوں میں پھیل گئی پردہ دار غم نہ ہوئی
کچھ ایسی آگ تھی دل کی دوا سے کم نہ ہوئی

مرض تمہارا دواؤں سے مات کھا نہ سکا
عجیب زخم تھے دل کے کہ مندمل نہ ہوئے
اجل قریب تھی پھر بھی نفس کی بندش میں
وہ درد تھے کہ ہواؤں میں منتقل نہ ہوئے

تمہارے پاس سے گذرا قریب جانہ سکا
یہ اتفاق تمہیں دیکھنے بھی آ نہ سکا

زمانہ اپنے کئے پر بہت پشیماں تھا
مگر اداس بغاوت کے آگے اک نہ چلی
اب اہتمام چراغاں سے بزم کیا سجتی
چتا میں آگ لگاتے رہے چتا نہ جلی

ہر اہتمام کے باوصف زخم بھر نہ سکا
مری اداس نگاہی کو ختم کرنہ سکا

اِدھر شباب مرا شاعری میں ڈھلنے لگا
اُدھر طبیبوں کے ہاتھوں سے نبض چھوٹ گئی
اِدھر میں شعروں میں دل کا لہو اگلنے لگا
اُدھر تمہاری جوانی کی شام آپہونچی

جمی ہوئی تھیں نگاہیں فراز ساحل پر
اب اپنے پاؤں سفر میں تھے آنکھ منزل پر

غموں کی آنکھ مری بیکسی پہ بھر آئی
مرے لبوں کا تبسم نے ساتھ چھوڑ دیا
تمہارے بعد مری زیست میں خموشی تھی
کہ جس کو میرے ہی شعروں نے مل کے توڑ دیا

نہ جانے کیسے یہ سانسوں میں ڈوب کر آئی
تمہاری یاد ہر اک شعر میں اتر آئی

تم آج میری عیادت کو کیوں چلی آئیں
تمہیں تو خود بھی اب آرام کی ضرورت ہے
یہ اترا اترا سا چہرہ یہ مضمحل سے نقوش
تغیرات سے مجھ کو بڑی شکایت ہے

عجب طرح سے رسوم حیات اپنائیں
یہ تم ہو یا ہے تمہاری وفا کی پرچھائیں

تم آگئی ہو تو کچھ یاد آرہا ہے مجھے
مری نگاہ کے آگے کتاب ماضی ہے
مگر یہ سوچ کے پائے خیال رک سے گئے
کہ میرا حال ہی میرا جواب ماضی ہے

میں مطمئن ہوں کہ اک غم اٹھا رہا ہے مجھے
بڑی ادا سے زمانہ مٹا رہا ہے مجھے

یہ دیکھ لو وہی کمرہ ہے جس میں پہلی بار
مرے شباب کی تصویر تم نے دیکھی تھی
تمہارے سامنے کانس ہے اور وہی تصویر
وہیں پہ رکھی ہے اس دن جہاں پہ رکھی تھی

مگر فریم کے شیشے پہ جم گیا ہے غبار
بتا رہی ہیں فضائیں بہت اڑا ہے غبار

غبار جس نے تمھیں دور کردیا مجھ سے
نگاہ بھر کے تمھیں دیکھ بھی نہیں سکتا
تمھیں بھی میرے خدو خال کیا نظر آئیں
نہ جانے کب تک اٹھے گا یہ خاک کا پردہ

وہ خاک جس نے تمھیں دور کردیا مجھ سے
غبار جس نے مرا خواب لے لیا مجھ سے

دیوانے کی جنت

میرا یہ خواب کہ تم میرے قریب آئی ہو
اپنے سائے سے جھجکتی ہوئی گھبراتی ہوئی
اپنے احساس کی تحریک پہ شرماتی ہوئی
اپنے قدموں کی بھی آواز سے کتراتی ہوئی
اپنی سانسوں کے مہکتے ہوئے انداز لئے
اپنی خاموشی میں گہنائے ہوئے راز لئے
اپنے ہونٹوں پہ اک انجام کا آغاز لئے
دل کی دھڑکن کو بہت روکتی سمجھاتی ہوئی
اپنے آنچل کی ہوا بازی پہ کھسیاتی ہوئی
اپنی پائل کی غزل خوانی پہ جھلاتی ہوئی
نرم شانوں پہ جوانی کا نیا بار لئے
شوخ آنکھوں میں حجابات سے انکار لئے
تیز نبضوں میں ملاقات کے آثار لئے
کالے بالوں سے بکھرتی ہوئی چمپا کی مہک
سرخ عارض پہ دمکتے ہوئے شعلوں کی چمک
نیچی نظروں میں سمائی ہوئی خود دار جھجک
نقرئی جسم پہ وہ چاند کی کرنوں کی پھوار

چاندنی رات میں بجھتا ہوا پلکوں کا ستار
فرط جذبات سے مہکی ہوئی سانسوں کی قطار
دور ماضی کی بد انجام روایات لئے
نیچی نظریں وہی احساس ملاقات لئے
وہی ماحول وہی تاروں بھری رات لئے
آج تم آئی ہو دوہراتی ہوئی ماضی کو
میرا یہ خواب کہ تم میرے قریب آئی ہو
کاش اک خواب رہے تلخ حقیقت نہ بنے
یہ ملاقات بھی دیوانے کی جنت نہ بنے

جواں نظریں

وہ ایک ریلوے کو اٹر کی ایک کھڑکی سے
لگی ہوئی کوئی نادان نوجواں لڑکی
کھڑی ہے اور مجھے اس طرح دیکھے جاتی ہے
کہ جیسے میری نگاہوں میں اپنی نوعمری
ڈبو چکے تو کسی سے نظر ملائے گی
کس اعتماد سے اپنی نظر کی کشتی کو
مری نگاہوں کے طوفاں میں ڈال رکھا ہے
کہ میرے دل کی تہوں کو اتر کے چھو آئے
یہ کمسنی کے گلستاں کا گل بدن شعلہ
بہت حسیں تو نہیں ہے مگر جوانی نے
گداز جسم کو چنگاریوں میں گوندھا ہے
نظر کو گرمئ جذبات نے تپایا ہے
میں ایک ریل کے ڈبے میں جس کا کواٹر سے
برائے نام سا کچھ فاصلہ رہا ہوگا
یہ بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ راستہ چلتا
میں اجنبی ہوں جسے کوئی ہم سفر بھی مرا

نہ جانتا ہے نہ اپنائیت کی نظروں سے
غریب دل میں اترنے کا قصد رکھتا ہے
مگر یہ فاصلہ اس اک جواں نظر میں نہیں
جو بار شرم اٹھاتے ہوئے جھجکتی ہے
جو صرف میرے لئے بار بار اٹھتی ہے
یہ لمحہ بھر کے لئے ہو کہ مدتوں کے لئے
جوان نظروں کا آپس میں اک تعلق ہے
جسے بھلا کے یہ فطرت سے لڑ نہیں سکتیں
کہیں ملیں یہ مگر اجنبی نہیں ہوتیں

تیری یاد

میں تری یاد کو سینے سے لگائے گذرا
اجنبی شہر کی مشغول گذر گاہوں سے
بے وفائی کی طرح پھیلی ہوئی راہوں سے
نئی تہذیب کے آباد بیابانوں سے
دست مزدور پہ ہنستے ہوئے ایوانوں سے

میں تری یاد کو سینے سے لگائے گذرا

گاؤں کی دوپہری دھوپ کے سناٹوں سے
خشک نہروں کے کناروں پہ تھکی چھاؤں سے
اپنے دل کی طرح روئی ہوئی پگ ڈنڈی سے

میں تری یاد کو سینے سے لگائے پہونچا

بستیاں چھوڑ کے ترسے ہوئے ویرانوں میں
تلخیٔ دہر سمیٹے ہوئے میخانوں میں
خون انسان پہ پلتے ہوئے انسانوں میں
جانے پہچانے ہوئے لوگوں میں انجانوں میں

میں تری یاد کو سینے سے لگائے پہونچا

اپنے احباب ترے غم کے پرستاروں میں
اپنی روٹھی ہوئی تقدیر کے غم خواروں میں
اپنے ہم منزل وہم راستہ فنکاروں میں
اور فن کار کی سانسوں کے خریداروں میں

میں تری یاد کو سینے سے لگائے پہونچا

یہ سمجھ کر کہ کوئی آنکھ اِدھر اُٹھے گی
میری مغموم نگاہی کو مجھے سمجھے گی
لیکن اے دوست یہ دنیا ہے یہاں تیرا غم
ایک انسان کو تسکین بھی دے سکتا ہے
ایک انسان کا آرام بھی لے سکتا ہے
خوں میں ڈوبی ہوئی تحریر بھی بن سکتا ہے
ایک فن کار کی تقدیر بھی بن سکتا ہے
ساری دنیا کے مگر کام نہیں آ سکتا
سب کے ہونٹوں پہ ترا نام نہیں آ سکتا

ماضی

تھکی ہوئی جنوری کی شب ہے اداس تاروں کا قافلہ ہے
مشاغل زندگی کا افسوں خموش راہوں میں کھو چکا ہے
کہیں دیئے ٹمٹمارہے ہیں بجھے اندھیرے سلگ رہے ہیں
سلگتے ہونٹوں پہ ان کے خوابیدہ کتنی راتوں کا مرثیہ ہے
فضائیں قصبے کی سوئی آنکھوں پہ اس طرح سے جھکی ہوئی ہیں
ستار پر جیسے گاتے گاتے ابھی کوئی تھک کے سو گیا ہے
مگر امارت کے مشغلوں کو نظام فطرت کا غم نہیں ہے
ہے اک محلہ میں جشن شادی جہاں چراغوں کا سلسلہ ہے
حسین آرائشوں سے ماحول کی ادائیں بدل گئی ہیں
سہاگ گیتوں نے مل کے خاموشیوں کو بے باک کر دیا ہے
بڑے گھرانے کی ایک لڑکی نیا سفر کانپتے ارادے
کہار ڈولا اٹھا رہے ہیں سہاگ سانسوں میں گھل رہا ہے
اسی محلے کے اک اندھیرے مکاں میں اک نوجواں اکیلا
اداس بیٹھا ہوا مقدر پہ اپنے آنسو بہا رہا ہے
حسین یادیں سمٹ رہی ہیں پرانے خط مسکرا رہے ہیں
قریب رکھی ہوئی انگیٹھی میں اپنا ماضی جلا رہا ہے

دیوانے دو

صرف احساس جدائی سے بہلتے رہنا
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے سنبھلتے رہنا
بیکسی اور یہ اترا ہوا چہرہ شب کا
میں اکیلا ہوں مرے ساتھ ہی چلتے رہنا

اور کچھ دیر چراغو! ابھی جلتے رہنا

ابھی امیدوں کی نظروں میں چمک باقی ہے
ابھی ان بیلے کی کلیوں میں مہک باقی ہے
ان کے آنے کی توقع تو نہیں ہے پھر بھی
سوچنے کے لئے گنجائش شک باقی ہے

سیکھ لوں تم سے ہی ممکن ہے سنبھلتے رہنا
اور کچھ دیر چراغو! ابھی جلتے رہنا

سوچتا ہوں کئی امید سحر میں ہوں گے
کتنے ہی میری طرح اور سفر میں ہوں گے
اپنی منزل کی تمنائیں لئے حسرت سے
کتنے افسانے ابھی راہگذر میں ہوں گے

تم ہواؤں کے ارادوں کو بدلتے رہنا
اور کچھ دیر چراغو! ابھی جلتے رہنا

ڈھل چکی رات ہوئے بند لب زخم جگر
رہ گئی دل میں اندھیروں کے تمنائے سحر
کوئی آیا نہ اِدھر رات کے سناٹوں میں
منتظر ہی رہی معصوم دعاؤں کی نظر

اب کسی امید پہ کہہ دوں کہ بہلتے رہنا
اور کچھ دیر چراغو! ابھی جلتے رہنا

تھک گیا درد ٹھہرنے لگے سانسوں کے قدم
غم کے احساس سے گھٹنے لگا امید کا دم
نا امیدی نے امیدوں کو کہاں چھوڑ دیا
کھل نہ جائے مری خاموش محبت کا بھرم

عمر بھر میری طرح آگ میں جلتے رہنا
راس آیا نہ تمھیں بھی یہ پگھلتے رہنا

تم بھی بجھ جاؤ مرے دل کو بھی بجھ جانے دو
آخری بار مری آنکھوں کو بھر آنے دو
آج کی رات محبت پہ گراں گذرے گی
ختم ہوجائیں گے اک ساتھ ہی دیوانے دو

شوروم سے گل مرگ تک

(کشمیر کی حسین وادی گلِ مرگ کے کچھ خواب لمحے)

ایسا لگتا ہے کہ جاگیر ہو ان ہونٹوں کی
یہ تبسم یہ تکلم یہ گلابی رنگت
ایسا لگتا ہے کہ اک شعر کے دو مصرعوں میں
ایک شاعر نے سمودی ہو غزل کی قسمت

نیند یا آنکھوں پہ ترتیب سے پلکوں کا جھکاؤ
جیسے میخانوں پہ بدمست گھٹائیں جھومیں
جیسے ڈل لیک کے خاموش کناروں پہ چنار
چاندنی رات میں کچھ سوچ کے سایہ کرلیں

مخملی شانوں سے اتری ہوئی کالی زلفیں
جیسے سمٹی ہوئی راتیں کسی میخانے کی
روشنائی سے ابھی لکھ کے ہٹا ہو جیسے
کوئی کچھ سرخیاں اک حسن کی افسانے کی

کان کی بالیاں ٹھہرا ہوا وہ جادو ہیں
چال کے ساتھ جو چلتا ہے تو سناٹوں میں
نغمگیں ہو کے کئی راگ بکھر جاتے ہیں
اور ڈھل جاتا ہے سنگیت مری سانسوں میں

چمپئی رنگ پہ ٹھہری ہوئی اک سرخ لکیر
دست قدرت کی مہارت کا پتہ دیتی ہے
بڑھ کے خورشید کی اکثر کوئی گستاخ کرن
ایک رنگ اور انھیں رنگوں میں ملا دیتی ہے

ایسا لگتا ہے کہ بہزاد کی تصویر کوئی
اپنے شوروم کی تنہائی سے گھبرائی ہو
اور چپکے سے کسی شب کا سہارا لے کر
صبح گل مرگ کی بانہوں میں چلی آئی ہو

اتنے معصوم سے لہجوں کی روایات کہاں
تجربہ کار نگاہوں کے یہ انداز نہیں
ابھی راتیں ہی نہیں دن میں بھی لگ جاتی ہیں
ابھی ان آنکھوں کے سینے میں کوئی راز نہیں

اتنی نادانی بھی آنکھوں کی ہے تشریح طلب
میرے بے ربط خیالوں کو حجاب آتا ہے
کتنے بھرپور ہیں ان شرمگیں آنکھوں کے جواب
کہ مرے اپنے سوالوں کو حجاب آتا ہے

جسم ان اجنبی راہوں کا کہاں عادی ہے

ہر نئے موڑ کے آغاز پہ بل کھاتا ہے

بے کہا سا ہے تمہارا یہ گلابی آنچل

ایسے لمحات میں سینے سے ڈھلک جاتا ہے

تم ہو، گل مرگ کی وادی ہے، نئی راہیں ہیں

ایسے ماحول میں خاموش سفر کیا معنیٰ

آؤ یہ بھول کے کچھ بات کریں آج کہ کل

جانے پیدا کرے دنیا کی نظر کیا معنیٰ

آؤ گل مرگ سے اک دور کا آغاز کریں

تم مرے ساتھ چلو اور میں خاموش چلوں

تم ہر اک شعر میں دل بن کے دھڑکتی جاؤ

میں نئی نظم کی تخلیق میں مصروف رہوں

میری یہ نظم تمہاری ہے زمانے کی نہیں

آؤ اس نظمیہ شیشے میں اتار وں تم کو

تم میں کچھ دیر کو میں کھویا ہوا ہوں دیکھو

تم مرے بالوں سے کھیلو مجھے آواز نہ دو

مجھ کو دردیدہ نگاہوں سے نہ دیکھو دیکھو
اس طرح اپنا تعاقب مجھے منظور نہیں
یہ حجابات اک افسانہ نہ بن جائیں کہیں
تم مجھے بڑھ کے بلالو میں ابھی دور نہیں

بڑھ رہے ہیں بڑی تیزی سے چناری سائے
الوداعی سی ہیں سورج کی یہ پیازی کرنیں
اور کچھ دیر یہ لمحات رہیں گے اپنے
آج کے حادثے بن جائیں گے کل تک یادیں

پرورش پائی ہے تم نے نئے ماحولوں میں
ایک شاعر ابھی اس رنگ سے بے بہرہ ہے
تم بھلا دو اسے اک کھیل سمجھ کر لیکن
میرے دل کے لئے یہ نقش بہت گہرا ہے

آنسو فروش

میں دل کے زخموں کا ایک تاجر میں ایک آنسو فروش شاعر
میں زندگی کے اداس چہرے کی جھریاں بیچنے چلا ہوں
نظر کی تشنہ لبی کو میں نے مزاجِ فن میں سمودیا ہے
سیاہ راتوں سے جو ملی ہیں وہ تلخیاں بیچنے چلا ہوں

گناہگار آنکھ کے اشارے پلک سے ڈھلکے ہوئے ستارے
تھمی ہوئی تیرگی کے سائے مٹے مٹے روشنی کے خاکے
لٹے ہوئے کارواں کا ماضی شکست کھائے ہوئے ارادے
میں مردہ انسانیت کے دامن کی دھجیاں بیچنے چلا ہوں

خلوص کی زندگی کے لالے وفا کا خون جان کی تباہی
جھکی نگاہوں کی کج ادائی جوان ہونٹوں کی بیوفائی
نئے زمانے کی طنز خوئی حسین ماضی کی بے ثباتی
ہزار ہونٹوں کی بات کرتی خموشیاں بیچنے چلا ہوں
کوئی خریدو کہ بات کرتی خموشیاں بیچنے جلا ہوں

کوئی خریدو کہ آج خودداریوں کا ماتھا جھکا ہوا ہے
کوئی خریدو کہ آج فن کار زندہ رہنا بھی چاہتا ہے
خفیف نظروں سے اپنے فن کو ہر ایک چہرہ کو دیکھتا ہے

یہ لمحہ تاریخ ہی کو دیدو کہ اس کا ماضی سے سلسلہ ہے
ہر ایسے لمحے کو اک امانت بنا کے تاریخ نے رکھا ہے
مگر امانت بنا کے رکھنے کا سلسلہ کب تلک رہے گا
رگوں سے فن کار کی کہاں تک یہ قطرہ قطرہ لہو بہے گا

نظر اور خوشبو

ٹوٹتی شب، یہ اندھیرے، یہ گنہگار فضا
اجنبی فکر سے بوجھل یہ تمہارے پاؤں
کس طرح اٹھے مرے گھر کی طرف رات گئے
سوچتا ہوں تو میری سانس رکی جاتی ہے
کتنی مشکوک خموشی کی جگر کاری کو
آج کے بعد نہ ملنے کا شبہ آنکھوں سے
اشک بنتا ہے لرزتا ہے ٹپک جاتا ہے
یہ تقاضہ ہے کہ میں پھیر دوں وہ سارے خطوط
جن کے ہر لفظ کو نیندوں کا لہو دے دے کر
میں نے راتوں کی خموشی میں بدن ڈھالا تھا
جن سے تشہیر کا سامان بھی ہوسکتا ہے
پیار کے رشتے کا ایمان بھی ہوسکتا ہے
جن میں کچھ ایسے سوالات کئے تھے مجھ سے
آج تک جن کے جوابات مرتب نہ ہوئے
سوچتا ہی رہا میں وقت گذرتا ہی رہا
پیار کے زخم کو میں عمر سے بھرتا ہی رہا

یہ تقاضہ ہے کہ ہے میں پھیر دوں وہ سارے خطوط
جن کو آنکھوں میں لئے میں نے گذاریں راتیں
آج بھی جن کے لبوں پر ہیں تمہاری باتیں
ان میں وہ خط بھی ہیں جن کا کوئی مضمون نہیں
پھر بھی تنہائی میں اکثر یہ پڑھے جاتے ہیں
اور جینے کا سہارا سا بنے جاتے ہیں
تم مری طرح جو ممکن ہو تو مجبور نہ ہو
مصلحت ہے تو کم آمیز رہو دور رہو
میرے جینے کا سہارا تو نہ مانگو مجھ سے
خط اگر پھیر دیئے پھر بھی یہ اندیشہ ہے
یاد کرنے کی تمھیں خو تو نہیں جاسکتی
پھول کی پتیاں گرتی ہیں تو گرجائیں مگر
پھول کے جسم سے خوشبو تو نہیں جاسکتی

امانت

یہ ماضی جو مری تنہائیوں کے ساتھ رہتا ہے
یہ اک نادان بچے کی طرح تنہائی کو
اشارہ کرتا ہے ٹھوڑی پکڑ کر اور کہتا ہے
وہ دیکھو گاؤں کے سینے پہ سر رکھے ہوئے سرسوں
تمہاری کمسنی کھیلی ہے جس کی گود میں برسوں
نقوشِ پا سے اب تک ہر گلی کی مانگ روشن ہے
ابھی تک گود پھیلائے ہوئے ڈیرے کا آنگن ہے
رسیلی جامنوں کے پیڑ کی کمزور شاخوں نے
تمہاری انگلیوں کا ہر نشاں محفوظ رکھا ہے
لبوں پر جھیل کی گہرائیوں کے ہے بس اک شکوہ
کہ جب سے تم گئے ہو کوئی بھی ہم تک نہیں پہونچا
کنارے جھیل کے وہ پیڑ اب تک منتظر سا ہے
کب آؤ گے یہاں کپڑے اتارو گے نہاؤ گے
یہ ماضی جو مری تنہائیوں کے ساتھ رہتا ہے
یہ اک نادان بچے کی طرح تنہائی کو
اشارہ کرتا ہے ٹھوڑی پکڑ کر اور کہتا ہے

وہ دیکھو گاؤں کے کھلیانوں میں سویا ہوا جادو
نشیلی رات کی رانی وہ لو دیتی ہوئی خوشبو
دئیوں کا دھیمی دھیمی روشنی دینا دھواں دینا
شکستہ جھونپڑوں کا زندگی کو لوریاں دینا
کھنکتی ہیں رسوئی گھر میں الھڑ چوڑیاں اب تک
بھرا کی پولیاں لاتی ہیں سر پر بوڑھیاں اب تک
تلیہ کے کنارے کچی اینٹوں سے بنا مندر
سلگتے کنڈوں سے اٹھتی دھوئیں کی ملگجی چادر
ہرے کھیتوں کی مینڈوں پر سلگتے جسم کے سائے
لرزتے ہونٹ گھبرائی ہوئی سانسوں کے افسانے
لچکتی آم کی شاخوں پہ بل کھائے ہوئے جھولے
کسی کا بھاگنا یہ کہہ کے کوئی ہے ہمیں چھولے
وہ دیکھو زندگی کتنی حسیں ہے کتنی بھولی ہے
اسی آغوش میں آجاؤ جس میں آنکھ کھولی ہے
یہ ماضی جو مری تنہائیوں کے ساتھ رہتا ہے
یہ کہتا ہے کہ میں گذری ہوئی باتوں میں کھو جاؤں
تمہاری زلف سے مہکی ہوئی راتوں میں کھو جاؤں

اسے میں کیسے سمجھاؤں کہ اب یہ سانس کا ڈورا
اک ایسی دھار کی تلوار ہے جس پر گذرنا ہے
مجھے اور زندگی کے زخم کو ٹانکے لگانا ہیں
اسے میں کیسے سمجھاؤں کہ یہ ماضی کی تصویریں
اب اک ایسی امانت ہیں جسے میں رکھ نہیں سکتا
اگر رکھوں تو ناکارہ نکما کہہ کے یہ دنیا
مجھے ٹھوکر لگادے اور خود آگے کو بڑھ جائے
مری پسماندگی پر ہر نظر اٹھے ترس کھائے
مجھے مردہ عجائب گھر کی ایسی مورتی سمجھے
جو سب کو اس لئے پیاری ہے کہ کافی پرانی ہے
یہ ماضی جو مری تنہائیوں کے ساتھ رہتا ہے
اسے میں کیسے سمجھاؤں کہ یہ ماضی کی تصویریں
اب اک ایسی امانت ہیں جسے میں رکھ نہیں سکتا

میرا ساتھ نہ دو

اپنے ہی بارے میں سوچو
سوچ کو امکانات نہ دو

میری راہیں بہت الگ ہیں
جاؤ میرا ساتھ نہ دو

تم پھولوں کے پیچھے پاگل
میں خوشبو کا دیوانہ
مجھ کو خالی جام بہت ہیں
تم کو چاہئے میخانہ

جو میرے ہاتھوں میں آکر
کانپے ایسا ہاتھ نہ دو
میری راہیں بہت الگ ہیں
جاؤ میرا ساتھ نہ دو

تم کو شوق زمانہ جانے
میری دنیا تم ہی تم
تم کو رغبت دنیا بھر سے
میرا حوالہ تم ہی تم

جو میرے احساس سے کھیلیں
مجھ کو وہ دن رات نہ دو
میری راہیں بہت الگ ہیں
جاؤ میرا ساتھ نہ دو

تم چڑھتے سورج کے پجاری
میں راتوں کا ہمراہی
تم پکّی بالوں سے جھولو
میں پگ ڈنڈی دھول بھری

مجھ کو ہی مجھ سے جو چھڑا دیں
ایسے احساسات نہ دو
میری راہیں بہت الگ ہیں
جاؤ میرا ساتھ نہ دو

تم سونے چاندی کی چھن چھن
میں مٹی کیا سوندھا پن
تم اک شہر کا ٹیڑھا رستہ
میں گاؤں کا پھیلا پن

تم آوازوں کی اک دنیا
سناٹے کا ساتھ نہ دو
میری راہیں بہت الگ ہیں
جاؤ میرا ساتھ نہ دو

اے خواب سفر

اے خواب سفر تعبیر سفر
اے سمت سفر تقدیر سفر
لے سارے گلے بے جان ہوئے
تو اپنی شکایت پر نادم
میں اپنے لکھے پر شرمندہ
اب آ کہ بنیں ایک خواب نیا
جو آنکھوں آنکھوں سفر کرے
جو جذبوں کو بے جگر کرے
جو پیار کی خوشبو سے جاگے
جو قرب کے زانو پر سوئے
میں تجھ سے محبت کی دنیا
مانگوں تو مجھے مل ہی جائے
تو چاند کو چھونا چاہے تو
میں چاند زمیں پر لے آؤں
میں پیاسے ہونٹ دکھاؤں تو
تو سات سمندر نذر کرے
تو مجھ میں سمانا چاہے تو
شق ہوجاؤں دھرتی کی طرح

میں قلم اٹھاؤں لکھنے کو
تو لفظ بنے شہکار بنے
تو پیار کے نغمے گائے تو
میں گیت بنوں ملہار بنوں
تو جگنو کا ارمان کرے
میں مٹھی کھول کے دن دیدوں
میں ایک کرن کی بات کروں
تو سورج ڈال دے قدموں میں
تو کیا ہے کیسے بتلاؤں
میں لفظ کہاں سے لاؤں گا
تو کون ہے کس کو سمجھاؤں
میں خود سے بچھڑنا چاہوں گا
اے روح سفر اے جان سفر
اے حسن سفرامکان سفر
تو ایسے سمندر رشتے کو
کیوں لہرسا کوئی نام ہی دے
اس جھوٹ نما سچائی کو
کیا طے ہے کوئی الزام ہی دے

پھول جسمو

سنو اے پھول جسمو
کوئی بارش کا موسم تم پہ گذرے
تمہاری روح تک سیراب کر دے
خمیدہ پتیوں میں عزم بھر دے
گناہوں تک تمہیں بیدار کر دے
نکھارے خواب سی دوشیزگی کو
بھگو دے گفتگو میں خامشی کو
مگر اے پھول جسمو
تمہاری بھی عجب مجبوریاں ہیں
تم ایسی انگلیوں کے منتظر ہو
جو تم کو توڑ کے بے نام کر دیں
تمہیں گلدان کی زینت بنالیں
سجا کر کوٹ کے کالر پہ نکلیں
دکھائیں شہر کی سڑکوں پہ جلوہ
دکھاوا دست اندازی کا یوں ہو
کہ جیسے فاتح خوشبو یہی ہیں
نمائش کی گھڑی میں یاد رکھو

تو اک بارش کا موسم یاد رکھنا
جسے بے غرضیوں کا عارضہ ہے
جو پھولوں پر برسنا چاہتا ہے
جو آنسو پی کے ہنسنا جانتا ہے
لٹا کر بے زباں پیاسوں میں پانی
بذات خود ترسنا جانتا ہے

اے پیار سراپا

اے پیار سراپا
پھول نما بے نام امانت
جذبوں کی امکانوں کی
آنکھوں سے ادھورے خوابوں تک
تو جو کچھ ہے بس لفظوں تک
تو ایسی عجب سچائی ہے
جو سوئے ہے تقریروں میں
جاگے ہے تو بس تحریروں میں
تو جو کچھ ہے بس لفظوں تک
اندازوں تک اظہاروں تک
تحریر ہی تیرا جادو ہے
تحریر میں تیری خوشبو ہے
تو نرمیٔ نسبت کیا جانے
تو گرمیٔ قربت کیا جانے
بے عنواں قصے کیا جانے
بے ربط سلیقے کیا جانے
یہ ہنسنے رونے والا دل

خاکی ہے، بہت کم مایہ ہے
چھوٹے چھوٹے جذبے اس کے
بس اس کا یہی سرمایہ ہے
یہ جذبوں کا اندھا ساتھی
لفظوں کے سہارے چلنے کا
عادی ہے نہ ایسا قائل ہے
جس ذہن میں بجلی کوندتی ہو
وہ اپنی ضمانت کیا دے گا
تحریر کی مبہم راہوں سے
گذرے گا تو کب تک گذرے گا
آ پیار سراپا پھول نما
آ اپنے سبھی امکانوں تک
آ تپتی سلگتی راہوں تک
آ مجھ کو بتا اوقات مری
آ چھین لے ساری بات مری
اے پیار سراپا پھول نما
لفظوں کے سہارے چھوڑ کے آ
یہ کاغذی رشتے توڑ کے آ

کچھ بوجھ اٹھاؤں میں تیرا
کچھ میرے بوجھ کو تو لے لے
کچھ ذہن سے تیرے جالے ہٹیں
کچھ میری نگاہیں روشن ہوں
میں تیرا جنوں پہچان سکوں
تو میری حقیقت جان سکے
میں تیری نظر کی گہرائی
بیتابی سے اپنی ناپ سکوں
تو میری نظر کا بگڑا پن
اپنے انداز سے تول سکے
بے دست و پا سے جذبوں کا
دریا میں اترنا مشکل ہو
میں آگ سی لہروں میں ڈوبوں
چاہوں تو ابھرنا مشکل ہو
یوں آنکھ جھکے سر اونچا ہو
ہر خواب سے منظر اونچا ہو
اے پیار سراپا پھول نما
اے پیار سراپا پھول نما

قلم برداشتہ

تو کہ پردہ میں بھی نمایاں بھی
تو کہ مشکل بھی اور آساں بھی
تو کہ خاموشیوں کی دنیا بھی
تو کہ اظہار کا سلیقہ بھی
تیری آنکھوں کی روشنی کا سفر
میری پرچھائیوں کے سینے پر
ایک وعدے پہ اعتبار کی بات
دیر تک اپنے انتظار کی بات
تجھ کو اے کاش یہ پتہ ہوتا
تیرا اس روز لاپتہ ہونا
کیسے کیسے سوال کرتا تھا
جتنا جیتا تھا اتنا مرتا تھا
پھر کئی دن عجیب حال رہا
سامنے اک بڑا سوال رہا
لکھنا چاہا تو لکھ نہیں پایا
شکوہ کرنا مجھے نہیں آیا
آج تیری طویل نظم کے ساتھ

ذہن میں آ رہی ہے ایسی بات
جس کو لفظوں سے چھوتے ڈرتا ہوں
ڈوبتا ہوں نہ پار اترتا ہوں
میں تو بس جھوٹ ہوں بناوٹ ہوں
اپنی ہی بدگمان آہٹ ہوں
میں دکھاووں کی راہ کا راہی
میری عادت سبھی کی دلداری
میرے جذبے صداقتوں سے پرے
میرے رشتے محض دکھاوے کے
میں ہوا آسمان کا تارا
اور تو ایک مٹی کا ذرہ
عزتیں میری برتری میری
اور ساری اذیتیں تیری
سب کو بہلانا میری فطرت ہے
یعنی یہ پیار میری عادت ہے
اپنے جھوٹے چلن سے زندہ ہوں
اور ترے سچے پن سے ڈرتا ہوں
لفظ سب جھوٹے اور بے معنی
یعنی میرا وجود سیلانی

مجھ کو اس طرح سوچنے والے
تو تعلق کا درد کیا جانے
جھوٹ اس پر کہاں کرے گا یقیں
سچ بتانے کا جس پہ وقت نہیں
وہ دکھاوے کا درد کیا سہتا
اپنے ہاتھوں میں جو نہیں رہتا
پھر بھلا مجھ سے بدگمانی کیوں
اتنی بے ربط سی کہانی کیوں
میری سچائیوں پہ شک کرنا
ہے گناہوں سے جوڑنا رشتہ
میرے بارے میں ایسا کیوں سوچا
کہ میں اپنی نظر سے گرنے لگا
میرے بارے میں اپنی سوچ بدل
ایک لمبے سفر پہ ساتھ نکل
دھوپ کو چاندنی بنانے تک
جبر سہنا ہے مسکرانے تک
زندگی پہلے ہی اداس سی ہے
اک کرن وہ بھی بدحواس سی ہے
روشنی کو اسیر کرنے تک
ساتھ دے آفتاب ابھرنے تک

میں تمھیں دکھ نہ دوں تو کس کو دوں

میں تمھیں دکھ نہ دوں تو کس کو دوں
کون اتنا قریب ہے میرے
اتنا اپنا تو میرا کوئی نہیں
جو مجھے مجھ سے دور لے جائے
جو مرے ایسے وقت کام آئے
جب امیدوں کا ہر دیا بجھ جائے
جو مری خلوتوں کو پہچانے
سو اندھیروں میں راہ دکھلائے
اور میں پورے اعتماد کے ساتھ
ہاتھ اس کا کچھ ایسے ہاتھ میں لوں
جیسے وہ بے لکھا مقدر ہو
جیسا باہر ہو ویسا اندر ہو
اس کے ہونٹوں پہ ہونٹ یوں رکھوں
جیسے ان پھول پتیوں کا نشہ
میرے بیراگ کی امانت ہو
جسم کا ایک ایک حرف کھلے

اور غزل کی اشاریت کا سفر
ختم ہو کر سہاگ نظم بنے
میں جو ایسے میں بولنا چاہوں
سی دے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے
اور اس کیفیت میں لے آئے
جو اسیر زباں نہیں ہوتی
بس تصور میں رنگ بھرتی ہے
جگنوؤں کی طرح چمکتی ہے
اور اندھیروں میں رقص کرتی ہے
میں تمھیں دکھ نہ دوں تو کس کو دوں
تم مری چاہ کی صداقت ہو
تم مرا خواب، ہو حقیقت ہو
سب تو وقتی سکھوں کے ساتھی ہیں
چاہتیں ان کی بے غرض کب ہیں
یہ مداری ہیں جن کا سارا کام
بس مرے ناچنے سے چلتا ہے
ان کی چھوڑو یہ مانگنے والے
تم سے ہر بازی ہار جائیں گے

ان سے کوئی امید کیا رکھوں
اور تمھیں دکھ نہ دوں تو کس کو دوں
تم مرا اعتبار ہی تو ہو
تم مرا اختیار ہی تو ہو
تم سے بڑھ کر بھلا کہاں کوئی
جو یہ بارِ گراں اٹھا پائے
کوئی بے سمتیِ سفر کو یوں
اپنی منزل بنانے والا ہے
کون ان دیکھی آہٹوں سے یوں
جاگی آنکھیں سجانے والا ہے
کون اک جاگتے مسافر کو
اپنی نیندیں سلانے والا ہے
فون جن انگلیوں سے ہوتا ہے
ان کی محرومیاں سمجھتا ہوں
لاؤ ان انگلیوں کو چومتا ہوں
جو مجھے ڈھونڈنے نکلتی ہیں
اور مایوس بھی نہیں ہوتیں
ان کی مصروفیت سمجھتا ہوں

کبھی بالوں سے کھیلتی ہیں تو یہ
کبھی آنکھوں پہ رکھی جاتی ہیں
کبھی دل کی طرف سرکتی ہیں
دھڑکنوں کے شمار کرنے کو
رینگتی ہیں تمام جسم پہ یوں
جیسے میں چور ہوں یہ پہریدار
تھک گئی ہیں یہ انگلیاں تو لاؤ
میں انھیں پھر سے تازہ دم کردوں
تم لکھو اور لکھتی ہی جاؤ
چوم کر میں انھیں قلم کردوں
مجھ کو احساس ہے میں جانتا ہوں
کتنا ایثار کر رہی ہو تم
عظمتیں تم پہ ناز کرتی ہیں
اور میری صلاحیتوں کی حدیں
تم سے نظریں ملاتے ڈرتی ہیں

ڈوبی جاؤں

تیری ایک نجر ہی مجھ کو دھوپ سے کرگئی چھاؤں
سجن یہ بات کسے بتلاؤں

تن کی تپتی ریت پہ جیسے پھوار گرے شبنم کی
کیسی لجاّ ہین چھون پاپی تیرے موسم کی
بدرا بدرا سج سجاؤں دھوپ دھوپ شرماؤں

سجن یہ بات کسے بتلاؤں

کل تک جس درپن میں میں تھی اور مرے ویرانے
آج اسی درپن میں تو ہی تو ہے تو کیا جانے
میرے اندر چور چھپا ہے جانے کب چرجاؤں

سجن یہ بات کسے بتلاؤں

روز کے دیکھے بھالے منظر آج کچھ اور کہیں ہیں
دنیا بھر کی ندیاں جیسے میرے ساتھ بہیں ہیں
کیسا کنارہ ہاتھ میں آیا ہے کہ ڈوبی جاؤں

سجن یہ بات کسے بتلاؤں

سجن میں بھول گئی یہ بات

تو امبر کی آنکھ کا تارا میرے چھوئے ہاتھ
سجن میں بھول گئی یہ بات

تجھ کو سارے من سے چاہا، چاہا سارے تن سے
اپنے پورے پن سے چاہا اور ادھورے پن سے
پانی کی اک بوند کہاں اور کہاں بھری برسات

سجن میں بھول گئی یہ بات

جنم جنم مانگوں گی تجھ کو تو مجھ کو ٹھکرانا
میں ماٹی میں مل جاؤں گی تو ماٹی ہوجانا
لہر کے آگے کیا اک چھوٹے تنکے کی اوقات

سجن میں بھول گئی یہ بات

تیری اُور ہی دیکھا میں نے اپنی اور نہ دیکھا
جب جب بڑھنا چاہا پاؤں سے لپٹی لچھمن ریکھا
میں اپنے بھی ساتھ نہیں تھی تیرے دنیا ساتھ

سجن میں بھول گئی یہ بات

ہاتھوں سے پتوار گئی

میں کس بیری کے دُوار گئی من جیت ہوئی تن ہار گئی
میں کس بیری کے دُوار گئی

اپماؤں سے سمبندھوں کے نام مرا احساس
دھرتی سے امبر تک میں ہوں اور مری اک پیاس
ایک نجر کی لہر اٹھی میں سات سمندر پار گئی

میں کس بیری کے دُوار گئی

نینوں میں اک بات لئے پھرنے کی ایک امنگ
کوئی نہ جانے کوئی تو جانے من ہی من میں جنگ
آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے ہاتھوں سے پتوار گئی

میں کس بیری کے دُوار گئی

رنگوں کے معنیٰ بدلے معنی کے بدلے رنگ
ایک کھلے آکاش سے رشتہ جوڑے ایک پتنگ
اپنی چھوٹی سی انگنائی چھوڑ کے میں بیکار گئی

میں کس بیری کے دُوار گئی

پینگ بڑھائے

من بدرا سنگ پینگ بڑھائے تن میں بجری سے لہرائے
کیسو موسم آیو سکھی ری پھول چنوں کانٹا چبھ جائے

بن بھیگے اپون بھیگے میں من ہی من میں بھیگوں
ناگ پھن اپنا بین پہ مارے بین گرے میں رتجھوں

گلے گلے پانی آپہنچا دیکھوں مجھ کو کون بچائے
من بدرا سنگ پینگ بڑھائے

بھیگی دھرتی کے انکر سا انگ انگ اترائے
من سے بھید چھپانا چاہوں تن سے کھل کھل جائے

ایک ہوا کا جھونکا آئے اور مرا سب کچھ لے جائے
من بدرا سنگ پینگ بڑھائے

جاؤ آنسو پوچھو

پیار کی چھلکی ہوئی گگری سنبھالو
جاؤ آنسو پوچھو

کس کے بس میں ساتھ دینا ہے کسی کا
کیا بھروسہ پھول جیسی زندگی کا
جو بھی لمحہ بچ سکے اس کو بچالو

جاؤ آنسو پوچھو

میرے ہاتھوں کی لکیروں کو نہ دیکھو
ہاتھ پھیلائے فقیروں کو نہ دیکھو
ہاتھ اپنا میرے ہاتھوں سے چھڑالو

جاؤ آنسو پوچھو

سوپن یہ سمجھو کہ دیکھے ہی نہیں تھے
عمر بھر رہتے وہ رشتے ہی نہیں تھے
اس بلا کا بوجھ پلکوں پر نہ ڈالو

جاؤ آنسو پوچھو

بھلا میں مانوں کس کی بات

آنکھ کہے کہ دن نکلا ہے دل یہ کہے ہے رات
بھلا میں مانوں کس کی بات

چوراہوں کی بھیڑ میں کھوئی چہروں کی پہچان
شوق سے اب انسان کے روپ میں آجائے بھگوان
کچھ ہوتا ہے کچھ دکھتا ہے کچھ لگتا ہے ہاتھ

بھلا میں مانوں کس کی بات

مندر چپ ہے مسجد چپ ہے نفرت بول رہی ہے
اور سیاست زہر کہاں تک پہونچا تول رہی ہے
کچھ کے لئے یہ آگ کا موسم کچھ کے لئے برسات

بھلا میں مانوں کس کی بات

جسم کو آگ لگانے پر مجبور ہے پیٹ کی آگ
پھولوں نے انگارے پہنے گھر گھر پہونچی آگ
کوئی اسے کہتا پریورتن کوئی سیاسی گھات

بھلا میں مانوں کس کی بات

عورت کے سمان سے بڑھ کر عورت کی مجبوری
مرد کو پورا کرنے ہی میں عورت ہوئی ادھوری
جنم جنم اس کی ہو جائے جس کو تھما دو ہاتھ

بھلا میں مانوں کس کی بات

آہٹ ہی آہٹ

بھات چڑھے چولہے پہ ڈوار ہوئی کھٹ کھٹ
جلمی نے گھر بھی سمجھ لیا پنگھٹ

آنگن کی دوری سمندر لاگے
پار کروں کیسے بہت ڈر لاگے

ہنڈیا میں کچھ پچ تو من میں بڑا سنکٹ
جلمی نے گھر بھی سمجھ لیا پنگھٹ

پیار کہے جاجا لاج کہے ناجا
چھوٹی سے کٹیا بڑی مریادا

چھمن کی ریکھا بھئی بابل کی چوکھٹ
جلمی نے گھر بھی سمجھ لیا پنگھٹ

گھر کی رسوئی پہ ممتا کا پہرا
چولہے میں رکھا ہے سپنا سنہرا

باہر سے اندر تک آہٹ ہی آہٹ
جلمی نے گھر بھی سمجھ لیا پنگھٹ

چھوٹی چھوٹی خوشیاں اپنی

چھوٹی چھوٹی خوشیاں اپنی چھوٹے چھوٹے غم
ہم کیا جانیں ستادھری تیرے دین دھرم

پیٹ کی آگ بجھانے بھر کو پھرتے مارے مارے
گھر کا سپنا دیکھ دیکھ کے نین ہوئے بنجارے

کھیتوں کے سینے سے اُپجے اپنا ہر موسم
ہم کیا جانیں ستادھری تیرے دین دھرم

کھیت پڑا ہے گِروی جیسے غیر کے گھر، گھر والی
اپنے باغ کی سیوا سے وِنچت ہے باغ کا مالی

قرضہ کیسے اترے بانٹے کون کسی کا غم
ہم کیا جانیں ستادھری تیرے دین دھرم

چھوری بھئی سیانی لاگی چنتا بڑی مہان
بیاہی جانے سے گوہنے تک پل پل صدی سمان

شہنائی بجتے ہی جیسے پھوٹ پڑے سرگم
ہم کیا جانیں ستادھری تیرے دین دھرم

غمی کسی کے گھر ہو سگرے گاؤں جلے نہ چولہا
بن آشیر وچن بوڑھوں کے، بنے نہ کوئی دولہا

کٹیا اک گھر سے ہی جائے گھر گھر آنکھیں نم
ہم کیا جانیں ستادھرمی تیرے دین دھرم

میرا پیار نہ ہو تو

دھرتی کیسے ناج اُگائے، امبر کیا پانی برسائے
میرا پیار نہ ہو تو ساجن دور تلک سوکھا پڑ جائے

ہرا بھرا سب میرے دم سے باقی سب کچھ دھول
میرے کارن پھول میں خوشبو ورنہ پھول بھی شول

میرے پیار کو چھو جائے تو مٹی بھی سونا ہو جائے
میرا پیار نہ ہو تو ساجن دور تلک سوکھا پڑ جائے

ہنستے گاتے میلے ٹھیلے رنگ بھرے تیوہار
پیا ملن کی آس نہ ہو تو سب کے سب بیکار

پیار جگے تو گھونگھٹ کا ابھیمان دھرا رکھا رہ جائے
میرا پیار نہ ہو تو ساجن دور تلک سوکھا پڑ جائے

پیار نگر تک آنے والے سارے رستے چور
پھر بھی ان رستوں پر آنے والوں کا اک شور

مریادائیں آس بندھائیں ہر بندھن رستہ دکھلائے
میرا پیار نہ ہو تو ساجن دور تلک سوکھا پڑ جائے

دھواں دھواں شہروں میں ٹوٹے پن کا پاگل شور
آنکھوں کی سیما سے آگے بڑھے نہ من کا چور

میرے پیار کی انگلی تھامے کل یگ بھی ست یگ ہو جائے
میرا پیار نہ ہو تو ساجن دور تلک سوکھا پڑ جائے

پچھتاوے

سپنے جیسا یوون اڑتی تتلی جیسا پیار
کہیں مل جائے پھر اک بار

پھولوں میں بس کر رہ جاؤں خوشبو کے پر کتروں
پائل کی آواز کو اپنے پاؤں سے باندھ کے رکھوں

پت جھر پراب کبھی نہ کھلنے دوں گی اپنے دوار
کہیں مل جائے پھر اک بار

ساون کو چنری کرلوں سانسوں میں رکھ لوں بوندیں
بانہوں کے گھیرے میں لے لوں چاند کی پیاسی کرنیں

عمر سے اب کے چھین ہی لوں گی ڈھلنے کا ادھیکار
کہیں مل جائے پھر اک بار

کیسے کیسے بھاوک پلی ابھیمان کی بھینٹ چڑھائے
ساجن میں خود سوئی اور تجھے تارے گنوائے

اب نہ کبھی جیتوں گی میں نے مانی ایسی ہار
کہیں مل جائے پھر اک بار

لہروں جیسا پیار

جھیلوں جیسا منوا میرا لہروں جیسا پیار
کہ میرا لہروں جیسا پیار

سناٹے کی چادر اوڑھے سوئے سگرا گاؤں
پاؤں کی پائل کھول کے اپنے پیا سے ملنے جاؤں

سینہ میرا گھائل کردے سانسوں کی تلوار
کہ میرا لہروں جیسا پیار

کون سا بھید بتاؤں سکھیو کون سا بھید چھپاؤں
گاؤں کی چوپال سے گذروں سانسیں روکتی جاؤں

موری جیت بھی ایسی لاگے جیسے موری ہار
کہ میرا لہروں جیسا پیار

درپن کی چوکھٹ پر پہروں کھڑی کھڑی شرماؤں
پچھلی سانجھ کا وعدہ توڑ کے من ہی من پچھتاؤں

اس سنسار میں میرے اپنے سوپن کا اک سنسار
کہ میرا لہروں جیسا پیار

پکّی بالی کی طرح میرا جسم جھولے کھائے
ان جانی بانسریا کی لَے پر منوا لہرائے

یوون کے منجھدھار سے کانپیں مریادا پتوار
کہ میرا لہروں جیسا پیار

سکھیوں سے ہی ملنا چاہوں ان سے ہی کتراؤں
اپنے من کی گہرائی میں خود ہی ڈوبتی جاؤں

اک دوجے کو گھور رہے ہیں نیا اور پتوار
سجنوا لہروں جیسا پیار

مجھ برہن کی پیاس

انوراگی ساون کیا جانے مجھ برہن کی پیاس
نہ جانے مجھ برہن کی پیاس

بادروا جب گھر آئے من میرا تن سے بولے
بوند بدن کے انگارے پر گرکر چھن سے بولے

ہر آہٹ پر چونک کے دیکھوں کوئی آس نہ پاس
نہ جانے مجھ برہن کی پیاس

کھیتوں کی ہریالی طعنے مارے ہنسی اُڑائے
بہتا جھرنا انگ انگ کو درپن سا دکھلائے

شرم سے دوہرا ہو ہوجائے بیراگی احساس
نہ جانے مجھ برہن کی پیاس

مست ہوا چنری سے کھیلے بے شرمی سکھلائے
پرکرتی بھی ساجن کی دوری کا لابھ اٹھائے

اتنے ہمت توڑنے والے اور مری اک آس
نہ جانے مجھ برہن کی پیاس

نیند کبھی آ بھی جائے تو جسم کا جادو جاگے
مجھ کو اپنے آپ سے اس موسم میں ڈر سا لاگے

رگ رگ میں لہرانے والے خون کو یہ بن باس
نہ جانے مجھ برہن کی پیاس

پیاسی ہولی

تو ہرا رنگ چڑھا تو میں نے کھیلی رنگ مچولی
مگر اب ساجن کیسی ہولی

تن کے سارے رنگ بھکاری من کا رنگ سہاگ
باہر باہر پورن ماشی اندر اندر آگ

انگ انگ لپٹوں میں لپٹا بولے تھا اک بولی
مگر اب ساجن کیسی ہولی

رنگ بہت شرمائے کچھ ایسی بھیگی پاپی کایا
تو نے اک اک رنگ میں کتنی بار مجھے دوہرایا

موسم آئے موسم بیتے میں نے آنکھ نہ کھولی
مگر اب ساجن کیسی ہولی

رنگ بہانہ رنگ زمانہ رنگ بڑا دیوانہ
رنگ میں ایسی ڈوبی ساجن رنگ کو رنگ نہ جانا

رنگوں کا اتہاس سجائے رنگوں رنگوں بولی
مگر اب ساجن کیسی ہولی

چونریا کاگج ہوئی جائے

چونریا کاگج ہوئی جائے جو دیکھے کچھ لکھ ہی جائے
بھری جوانی منہ سے نکلی بات چھپاؤں چھپ نا پائے

گھر آنگن میں پھول کھلے ہے مہکے ہے گلیارا
یوون کی خوشبو پر پہرہ دے باپو بیچارہ

آنکھ لگے تو خواب ستائے خواب کھلے تو نیند نہ آئے
چونریا کا گج ہوئی جائے

جسم کا پیالہ سانس بھرے تو روپ کی مدرا چھلکے
نجر نجر بٹ جائیں سارے رنگ مرے آنچل کے

رستوں کا انجانا پن بھی جانے بوجھے ہاتھ بڑھائے
چونریا کا گج ہوئی جائے

نیناں لیں انگڑائی نشہ لرزے مدرا کانپے
روپ کے سنگ سفر میں تھوڑی دور پہ درپن ہانپے

ہائے رے یہ احساس کہ جیسے کوئی چھوئے اور چھونا پائے
چونریا کا گج ہوئی جائے

نہ آئے شہر میں ایسی رات

پھولوں جیسے رشتے چھوٹے خوشبو جیسے ساتھ

نہ آئے شہر میں ایسی رات

ماں کی آنکھ کا تارا کھویا باپ کا ایک سہارا
گھر سے نکلا ہی کیوں تھا جو گھر کو لوٹ نہ پایا
جیون ٹھہرا ہانپتا پنچھی موت کے لمبے ہاتھ

نہ آئے شہر میں ایسی رات

سناٹے کا سینہ چیر گئی اک اندھی گولی
بہرے ہوئے برسوں کے رشتے گونگی پیار کی بولی
کس کی جیت کا جشن منائے آنسو کی برسات

نہ آئے شہر میں ایسی رات

خوب ہوئی بستی میں ویرانوں میں آنکھ مچولی
خوب کھلی اور خوب ہی کھیلی سب نے خون کی ہولی
کوئی تو ہو جو اتنا کہے کیا آیا کس کے ہاتھ

نہ آئے شہر میں ایسی رات

بند ہوا ہر دُوار

جیون کے اس موڑ پہ جیسے چھوٹ گیا سنسار

کہ جیسے روٹھ گیا سنسار

کویتا بازاروں میں لائی یادوں کا بیوہار
تنہائی سے رشتہ مانگا سناٹوں سے پیار
سُر ساگر میں چھوڑ کے مجھ کو ٹوٹ گیا ہر تار

کہ جیسے روٹھ گیا سنسار

سپنوں کے نیلام پہ روئی آنکھوں کی خود داری
ساگر ساگر ڈوب کے اُبھری پیاس کی اک چنگاری
سائے کو محتاج ہوئی ہے جسم کی یہ دیوار

کہ جیسے روٹھ گیا سنسار

چہرے کی دیوہار کتنا سے درپن ٹوٹا جائے
کل سے آج کا آج سے کل کا دامن چھوٹا جائے
گلی گلی سناٹا جاگے بند ہوا ہر دُوار

کہ جیسے روٹھ گیا سنسار

رات سہاگن بیوہ دن

سکھیوں کے گھر راتیں جاگیں مورا دن بھی سوئے

جوانی پیاس سے دامن دھوئے

بکھرے سپنے آنکھ سنبھالے پاپی من اندیشے
اپنا آپا لے کر نکلوں بھری بجریا کیسے
پہلے موڑ پہ لٹنے والا کیا پائے کیا کھوئے

جوانی پیاس سے دامن دھوئے

چاروں اور بہت سی آنکھیں اور اک جیون ہاری
عمر کے الھڑپن کے ہاتھوں موری پہریداری
سویا بندھن جاگ رہا ہے جاگتا کیسے سوئے

جوانی پیاس سے دامن دھوئے

دھوپ کی آڑ میں چھپ کر سورج بھیگے بال سکھائے
چاند اکیلا پاکر کھڑکی سے اندر آجائے
گھر آنگن کو نرک بنائیں مورے درد ابوئے

جوانی پیاس سے دامن دھوئے

درپن میں لہریں سو جائیں اور سمندر جاگے
انگڑائی کے بوجھ سے ابھرا جسم بھی مجرم لاگے
راتوں رات بہوں لہروں پر دریا پار نہ ہوئے

جوانی پیاس سے دامن دھوئے

کھیل ودھاتا ایک ابھاگن سے یہ کیسا کھیلا
ارتھی کے رتھ پر ہی بیٹھ کے آئی ملن کی بیلا
آنکھ اٹھا کر دیکھ نہ پائی تھی کہ ساجن کھوئے

جوانی پیاس سے دامن دھوئے

میرے گاؤں کی مٹی

میرے گاؤں کی مٹی تیری مہک بڑی البیلی
تیرا بھولا پن دنیا کی سب سے بڑی پہیلی

تیرے آنگن میں اترے ہیں سچے سچے موسم
تو اپنے سیدھے سادے رنگوں سے بھاری بھرکم
تیرے سامنے کیا لگتے ہیں بیلا جو ہی چمیلی
تیری مہک بڑی البیلی

بھور بھئے فصلیں انگڑائی لیں جاگیں کھلیان
کھیتوں میں سورج اترے تو کرنیں لگیں کسان
تو صدیوں سے ایک ہی جیسی پھر بھی نئی نویلی
تیری مہک بڑی البیلی

ساون کے جھولوں میں جھولیں جسموں کے انگارے
پینگیں بھرتی عمریں چڑھتی ندیاں بہتے دھارے
کوئی ہے ان میں لاج دُلاری کوئی بڑی کھل کھیلی
تیری مہک بڑی البیلی

ہریالی کو دیکھ دیکھ کے اپنا آپا آنکے
گھونٹ میں رہ کر بھی گوری سات سمندر جھانکے
آنکھ اُٹھاکر دیکھ لے جس کو اس کا اللہ بیلی
تیری مہک بڑی البیلی

ابھی ابھیاس نہیں

دور بھی رہنا آ جائے گا من کو ابھی ابھیاس نہیں
جیون بھر پیاسا رہنا ہے پل دو پل کی پیاس نہیں
دور بھی رہنا آ جائے گا من کو ابھی ابھیاس نہیں

شام ڈھلے یادوں کی کھڑکی کا ہر پٹ کھُل جائے
پائل گونجے چوڑی باجے کنگن کان میں گائے

ساتھ مرا ٹھکرانے والے کب تو میرے پاس نہیں
دور بھی رہنا آ جائے گا من کو ابھی ابھیاس نہیں

نیندوں کے اَدھروں پر اب بھی تیری ہی باتیں ہیں
آہٹ آہٹ چونک پڑیں ہیں کیا دشمن راتیں ہیں

تو میرے وِشواس کو لوٹے مجھ کو ابھی وِشواس نہیں
دور بھی رہنا آ جائے گا من کو ابھی ابھیاس نہیں

دل کا کیا تھا اک درپن جو ٹھیس لگی اور ٹوٹا
دیہہ کے میلے میں کیا آئے جنموں کا ناطہ ٹوٹا

ٹوٹ بکھر جانے کے آگے درپن کا اتہاس نہیں
دور بھی رہنا آ جائے گا من کو ابھی ابھیاس نہیں

درپن درپن

اپنا چہرہ کھو کر پگلا درپن درپن ڈھونڈھ رہا ہے
جسم کی دیواروں میں رہ کر من کا آنگن ڈھونڈھ رہا ہے

کھنڈروں میں راتوں کو اک آواز اکیلی جاگے
گونگے پتھر بات نہ پوچھیں ہیر پکارے رانجھے
سارے بندھن توڑنے والا پیار کا بندھن ڈھونڈھ رہا ہے
من کا آنگن ڈھونڈھ رہا ہے

پھول کی خوشبو کو چھونے کی فکر میں عمر گذاری
جیتے پتے ہاتھ میں لے کر جیون بازی ہاری
ہار کو جیت بنا لے اپنی ایسا سادھن ڈھونڈھ رہا ہے
من کا آنگن ڈھونڈھ رہا ہے

رشتوں کے بیوپار میں پڑ کر جیون داؤ لگائے
پتھر کھائے پتھر پوجے پتھر ہی اپنائے
کانٹوں کے ادھیکار میں رہ کر پھول کا دامن ڈھونڈھ رہا ہے
من کا آنگن ڈھونڈھ رہا ہے

سوپن ادھورے رہتے ہیں

سپنے دیکھنے والی آنکھو! سوپن ادھورے رہتے ہیں
مدھو شالہ میں عمر گنوا کر بھی من پیاسے رہتے ہیں
سپنے دیکھنے والی آنکھو!

شام کی آس لگائے پریمی شام کبھی نا آئے
وعدوں کی دہلیز پہ بیٹھے عمر یا بیتی جائے
پھول کا جیون مانگنے والے بھاگ میں کانٹے رہتے ہیں
سپنے دیکھنے والی آنکھو!

نینوں نینوں دوار سجائے دیوی درشن دوش
پریم کی رادھا جیو چتا میں کب سے جلے خاموش
اپدیشوں کی بھیڑ میں کنوارے جسم سلگتے رہتے ہیں
سپنے دیکھنے والی آنکھو!

عمر کی اُڑتی تتلی آنکھوں آنکھوں میں کھو جائے
ماضی بس اک یاد بنے اور حال کھڑا پچھتائے
جیون چتر کو رنگ دے کر بھی رنگ سسکتے رہتے ہیں
سپنے دیکھنے والی آنکھو!

اَدھروں کے نرمل کاندھوں پر چبھن ارتھی جائے
پیار کی کھائی وِشواسوں کی لاش سے بھرتی جائے
چاہت کے ناٹک میں چاہے بھی ان چاہے رہتے ہیں
سپنے دیکھنے والی آنکھو!

ویرانوں کو شہر بنا کر پگلا من مسکائے
کایا کی چھایا کے کارن آتما روپ گنوائے
پُنیہ کی جھیل کا پانی تھامے پاپ کے گھیرے رہتے ہیں
سپنے دیکھنے والی آنکھو!

آشاؤں کی ہولی

برہا کی اگنی میں جل گئی آشاؤں کی ہولی
آج مرا سناٹا مجھ سے کھیلے آنکھ مچولی

یادوں کی کستوری لئے میں شہروں شہروں جاؤں
خوابوں کی زنجیریں غم کی ہرنی کو پہناؤں
تپتی دھوپ میں کب تک من کی کچی آگ بجھاؤں

بازاروں میں کون لگائے انجانے کی بولی
آج مرا سناٹا مجھ سے کھیلے آنکھ مچولی

نیل گگن پر تارے جیسے زخموں کی بارات
چاند اکیلا جیسے تنہا تنہائی کی بات
رات اجالی ہو کر بھی ہے اندھیاروں کے ساتھ

آس کا کیا ہے جس نے پکارا ساتھ اسی کے بولی
آج مرا سناٹا مجھ سے کھیلے آنکھ مچولی

گہرے دریا میں کھو کر بھی موتی ہاتھ نہ آئے
دریا کی لہروں نے دیکھو کیا کیا رنگ دکھائے
طوفاں طوفاں زخم اُٹھائے موج موج ٹکرائے

اور ہوا یہ ساحل ساحل اپنی ناؤ ڈبولی
آج مرا سناٹا مجھ سے کھیلے آنکھ مچولی

عشق ہے آگ لگانے والا جیون ایک الاؤ
کب تک گھلنے دوں سانسوں میں تنہائی کے گھاؤ
کب سے نیناں کھوج رہے ہیں کہیں نظر تو آؤ
ایسے دیس بسا ہوں جس میں کوئی نہ سمجھے بولی
آج مرا سناٹا مجھ سے کھیلے آنکھ مچولی

خوشبو آنگن آنگن جائے

بانسریا وہ گیت کہ جس سے بستی کا سونا پن جائے
نغمے کا وہ پھول کہ جس کی خوشبو آنگن آنگن جائے
بانسریا وہ گیت کہ جس سے بستی کا سونا پن جائے

چہروں کے اس شہر میں جیسے سب جانے انجانے
نفرت کی وہ دھول اٹی ہے کون کسے پہچانے
دھرم کے نام پہ بہنے والے خون کا یہ سستا پن جائے
بانسریا وہ گیت کہ جس سے بستی کا سونا پن جائے

محلوں محلوں دن نکلے ہے کٹیوں کٹیوں رات
اندیشوں کے شہر کھڑی ہے سپنوں کی بارات
بوڑھے اپدیشوں کی گلیوں اب کیا باغی یوون جائے
بانسریا وہ گیت کہ جس سے بستی کا سونا پن جائے

پوجا کے پھولوں پر بھی لالچ کی اوس پڑی ہے
لجّت لجّت پریم کی دیوی آس کے دوار کھڑی ہے
انسانی اپہار کے سر سے سوارتھ کا یہ پاگل پن جائے
بانسریا وہ گیت کہ جس سے بستی کا سونا پن جائے

توڑ گیا ساون

دھرتی کو امبر سے جوڑ گیا ساون
جوڑا کچھ ایسے کہ توڑ گیا ساون

بوندوں میں اتریں سمندر سی باتیں
باہر کے ہونٹوں پہ اندر کی باتیں

بھیگے ہوؤں کو نچوڑ گیا ساون
جوڑا کچھ ایسے کہ توڑ گیا ساون

من میں چھڑیں ایسی بے نام جنگیں
انگڑائی بھی لے نہ پائیں امنگیں

ہونٹوں کو پیاسوں سے جوڑ گیا ساون
جوڑا کچھ ایسے کہ توڑ گیا ساون

دھرتی کو بانہوں میں بھرنے کی خواہش
پینگوں سے آکاش چھونے کی کوشش

جھولوں کو ہلتا ہی چھوڑ گیا ساون
جوڑا کچھ ایسے کہ توڑ گیا ساون

گونگے پہاڑوں سے بچتا بچاتا
بے جان کھنڈروں پہ آنسو بہاتا

نازک کلیا مروڑ گیا ساون
جوڑا کچھ ایسے کہ توڑ گیا ساون

چوری

تن من کی سدھ بدھ چرائے لیو موری
کوئی نہ سمجھے سجن توری چوری

راتوں سے پوچھوں کہ دن کب ہوگا
ٹھنڈا چندر ما اَگن کب ہوگا

اگنی بریکشا ہے سانسوں کی ڈوری
کوئی نہ سمجھے سجن توری چوری

آنکھیں جو دیکھیں وہ کیسے دکھاؤں
سوچوں میں کیا ہے وہ کس کو دکھاؤں

منھ سے جو بولوں تم لاج گئی موری
کوئی نہ سمجھے سجن توری چوری

ایسا پھرا ہے

ایسا پھرا ہے قلم مجھ سے میرا
نام لکھوں اپنا تو نام لکھے تیرا

درپن جو دیکھوں تو تجھ کو دکھائے
دوری کے دریا میں قربت نہائے

راتوں کے بس میں کہاں ہے سویرا
نام لکھوں اپنا تو نام لکھے تیرا

من کے سمرپن کی بھاشا الگ ہے
آشا الگ ہے نراشا الگ ہے

چاہے اجالا تو مانگے اندھیرا
نام لکھوں اپنا تو نام لکھے تیرا

پکڑے نہ من کا چور

امواکی ڈالی پہ کوئلیا کوکے مور مچائے شور
سجن کوئی پکڑے نہ من کا چور

سانسوں کی گرمی سے کایا پگھلے کوئی نہ جانے بھید
میری اک انگڑائی سے بچ کر گذریں چاروں وید

میں اک آگ کی چڑھتی ندیا تو ہی میرا زور
سجن کوئی پکڑے نہ من کا چور

جل کی مچھری جل جگ جانے جل باہرا گیان
اندر باہر شور نہ ہو تو جنگل بھی سنسان

تو جو تھامے ہاتھ تو بیری گھٹے ہوا کا زور
سجن کوئی پکڑے نہ من کا چور

فنکار

یہ عارض ترے جیسے بوسیدہ قبریں

یہ عارض ترے بوسہ گاہِ حوادث

جو شاداب رہتے

تو اوراقِ دوراں

ہزاروں فسانوں سے محروم رہتے

وسیم بریلوی

PUBLISHERS & DISTRIBUTORS :

MAKTABA JAMIA LTD.

Jamia Nagar, New Delhi-110025